باسی روٹی

(کہانیوں اور افسانوں کا مجموعہ)

BASI ROTI

Sayed Manzar Mehdi

سید منظر مہدی

باسی روٹی

(BASI ROTI)

منظر مہدی فیض آبادی

باسی روٹی

(کہانیوں اور افسانوں کا مجموعہ)

منظر مہدی فیض آبادی

یہ کتاب فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی
اتر پردیش کے مالی تعاون سے شائع ہوئی

BASI ROTI

(STORIES)

SAYED MANZAR MEHDI

نام کتاب	باسی روٹی
مصنف	سید منظر مہدی
ناشر	سید منظر مہدی
کمپوزنگ	خالد انصاری
سن اشاعت	۲۰۱۴ء
تعداد	پانچ سو
طباعت	سپنا آفسیٹ امام باڑہ روڈ، فیض آباد
قیمت	دوسو (۲۰۰) روپئے

☆☆☆ کتاب ملنے کے پتے ☆☆☆

۱۔ منظر مہدی، گلدستہ لین امام باڑہ فیض آباد

۲۔ دانش محل بک ڈپو امین آباد لکھنو

۳۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار جامع مسجد دہلی

ہر اس شخص کے نام جو اردو کو

صرف ایک زبان

ہی نہیں قومی یکجہتی اور تہذیب

کی علامت سمجھتا ہے

مختصر تعارف

نام :- سید منظر مہدی

پیدائش :- ۱۴ جولائی ۱۹۵۴ء فیض آباد (یو پی)

تعلیم :- ایم اے (اُردو) ایل ایل بی

دل چسپی :- ہر اس چیز میں جس سے صحت اور کردار کو بہت نقصان نہ پہنچے

بانی اور جنرل سکریٹری :- گلدستہ پروڈکشن سوسائٹی (ایک ثقافتی سماجی اور ادبی تنظیم)

صدر :- اردو پریس ایسوسی ایشن

کتابیں جو شائع ہو چکی ہیں :- 'مجنوں کی واپسی' (اردو) مزاحیہ خاکوں کا مجموعہ ، 'زمیں دار صاحب' ڈراموں کا مجموعہ (ہندی)

ADDRESS:: GULDASTA LANE , IMAMBARA ,

FAIZABAD (U.P)

PHONE ; 05278 - 260111, 225881

ترتیب

اُردو کی سواری ہے ذرا ٹھہر کر دیکھیں

اردو دنیا کی سب سے میٹھی زبان ہے، کسی کو عزت دینا ہو تو لوگ اردو کا استعمال کرتے ہیں۔ محبت کے اظہار کے لیے اردو سے بہتر کوئی زبان نہیں ہے۔ جس بزم میں اردو کا استعمال ہوتا ہے وہاں خود بہ خود قرینہ اور شائستگی آجاتی ہے۔ اس اٹل سچائی کے بعد بھی اردو کا جو حال ہے وہ کسی سے چھپا نہیں ہے۔ اردو کے دوست اور دشمن دونوں اچھی طرح جانتے ہیں کہ اردو کو مٹانے میں انکا زیادہ ہاتھ ہے جو اردو کی پرستاری کا دم بھرتے ہیں اور اردو پر مرمٹنے کا دعوہ کرتے ہیں۔ جن لوگوں کو اردو نے شہرت عزت اور دولت دی آج ان کے گھروں کے بچے انگریزی میڈیم میں پڑھ کر اردو سے نابلد ہو چکے ہیں ۔ اردو دوست کہلانے والوں کے گھروں میں نہ تو اردو کا کوئی اخبار آتا ہے نہ انکے بچے اردو سے واقفیت رکھتے ہیں۔ ایسے حالات میں اگر کوئی اردو میں کہانی اور افسانہ لکھے اور اس کو شائع کرانے کی جسارت کرے تو اسکو یا تو اردو کا عاشق کہا جائے گا یا دیوانہ کہا جائے گا۔

اردو کا رونا رونے کے بعد بھی اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہوگا کہ اردو جتنی نازک مزاج اور حسین زبان ہے اتنی ہی سخت جان بھی ہے۔ اردو کی بقا کے لیے جتنا کام کیا جارہا ہے اس سے کہیں زیادہ اردو کو مٹانے کی کوششیں بھی جاری ہیں۔ اردو ہے کہ مٹ کے نہ دے رہی ہے ۔غالب و میر کی زبان کہہ کر اگر اس کو دفن کیا جاتا ہے ۔ اقبال کا ترانہ کہہ کر اسکو فراموش کیا جاتا ہے ۔تو کبھی لتا منگیشکر کے گلے میں اتر کر تو کبھی جگجیت سنگھ کے سروں میں ڈھل کر اردو پھر زندہ ہو جاتی ہے۔ جب کسی ایک فرقہ کی زبان کہہ کر اردو کو گالی دی جاتی ہے تو پریم چند آگے بڑھ کر کہتے ہیں یہ ہماری زبان ہے، کرشن چندر کہتے ہیں ہماری ہے راجندر سنگھ بیدی کہتے ہیں یہ زبان نہیں ہے یہ تو

ہماری ماں ہے۔ برج نرائن چکبست کہتے ہیں اردو ہماری مادری زبان ہے۔کبھی آنند نرائن ملاتو کبھی گلزار دہلوی تو کبھی فراق اردو کا پرچم اٹھائے اردو دشمنوں کا منہ توڑ جواب دیتے نظر آتے ہیں۔اتنے چاہنے والوں کو دیکھ کر اردو دھیرے سے مسکراتی ہے اور اعلان کرتی ہے کہ میں ہندوستان کی زبان ہوں۔

جو اردو بول لیتے ہیں، اردو پڑھ لیتے ہیں اردو لکھ لیتے ہیں وہ اگر اردو پر عاشق ہیں تو کون سی خاص بات۔ساری خوبیاں جان لینے کے بعد تو ہر کوئی عشق کر لیتا ہے۔قابل ستائش تو وہ عشق ہوتا ہے جو گونگا بہرہ ہو۔اردو کے حسن کا جادو یہی ہے کہ جو لوگ اردو نہ بول پاتے ہیں نہ لکھ پاتے ہیں نہ پڑھ پاتے ہیں انکے سامنے جب اردو بولی جاتی ہے تو وہ اسطرح محظوظ ہوتے ہیں جیسے کوئل کی کوک کو سمجھے بغیر سننے کو دل چاہتا ہے۔پپیہے کا چہکنا، جھرنے کا گرنا ہر ایک کو اچھا لگتا ہے اسی طرح اردو کا بولا جانا سبھی کو پسند آتا ہے۔

دوسری زبانوں کو چھوڑ کر میں اگر اردو سے عشق کرتا ہوں تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے ۔اردو ہمارے گھر کی زبان ہی نہیں ایک ضرورت تھی ۔اردو میں خط لکھے جاتے تھے۔اردو ناولیں پڑھی جاتی تھیں۔گھر میں اردو کے اخبارات اور میگزین آتے تھے۔میری امی اور خالائیں رضیہ بٹ، عفت موہانی، سلمیٰ کنول، بشرہ رحمان اور عطیہ پروین جیسی ناول نگاروں پر فدا تھیں، ماموں علی حسین اور شاہد حسین ابن صفی کے دیوانے تھے۔ بچپنے میں جب ذہن ادب سے آشنا بھی نہیں تھا تب میں اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ ماموں شاہد حسین کا پیر اس شوق میں دبایا کرتا تھا کہ وہ ابن صفی کی ناولیں سناتے تھے۔ابن صفی کے قلم میں وہ دلکشی تھی کہ ہم سب کو اردو سیکھنے اور پڑھنے کا شوق ہو گیا۔ جب بڑا ہوا تو بابا لئیق اختر فیض بادی کے طنز و مزاح سے بھرپور قلم کا مزہ ملنے لگا۔روزنامہ قومی آواز، ماہ نامہ شمع، بیسویں صدی بانو، روبی وغیرہ ہم لوگوں کو بھی پسند آنے لگے۔روزگار کے لیے ایل ایل بی

کیا تھا لیکن اردو کی پرستاری میں اردو میں ایم اے بھی کر لیا۔

اردو پر ایک ایسا بھی وقت آیا کہ ملک کو آزادی دلانے والا روزنامہ 'قومی آواز' بند ہو گیا۔ بابا لئیق اختر فیض آبادی جو گلوریاں لکھا کرتے تھے قومی آواز بند ہونے کے بعد خود بھی خاموش ہو گئے ۔وہ روز صبح چوک آتے اور اردو کا کوئی اخبار اسٹال پر نہ دیکھ کر ایک زندہ لاش کی طرح گھر لوٹ جاتے ۔روز بازار آنہ اور خاموشی سے گھر لوٹ جانا انکا معمول بن گیا تھا۔ بابا کی اس کرب کو میں محسوس کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ جتنی محبت مجھ سے کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ قومی آواز سے کرتے ہیں ۔جب کبھی فیض آباد میں کسی وجہ سے قومی آواز نہیں آتا۔ اس دن کا اخبار لکھنو سے منگوایا جاتا تھا۔ قومی آواز کے ایڈیٹر عثمان غنی صاحب کے پاس ایک روپے بارہ آنے قومی آواز کی قیمت بھجوائی جاتی تھی جو ناغے والے دن کا اخبار سرکولیشن ڈپارٹ منٹ سے نکلوا کر دیتے تھے۔ یہ بات بھی دل چسپی سے خالی نہیں کہ جو شخص مفت میں روز آنہ اخبار کے لیے گلوریاں لکھتا تھا اسکو ایک عدد اخبار بھی بھیجا نہیں جاتا تھا۔ لئیق صاحب کی یہ مفت سیوا اردو سے والہانہ محبت کا نتیجہ تھی۔

لکھنو سے 'صحافت' نکلنا شروع ہو گیا تھا لیکن ابھی فیض آباد نہیں آتا تھا۔ بابا کی بے چینی مجھ سے دیکھی نہیں گئی۔ میں نے صحافت کو منگوا کر خود سر کولیٹ کرانا شروع کر دیا۔ صبح سائکل سے بس اسٹینڈ جاتا جہاں صحافت آ کر رکھا رہتا تھا۔ اخبار لیکر اپنے چند اردو دوستوں کے گھروں اور دو کانوں پر اخبار پہنچا کر لئیق اختر صاحب کو اخبار دیتا۔ شام کو اخبار کا رپورٹر بن جاتا۔ صحافت کے لیے خبریں لکھ کر بھیج دیتا۔ اسطرح میں اردو صحافی بن گیا۔ کالا کوٹ جو وکالت کے لیے بنوایا گیا تھا وہ بکس میں رکھ دیا گیا اور میز کی دراز میں رکھا ہوا قلم نکال کر صحافت شروع کر دی گئی۔ پہلے یہ کام اپنے بابا کے لیے شروع کیا تھا لیکن اب یہ پیشہ اچھا لگنے لگا باقاعدہ دوسرے اخباروں کے لیے بھی لکھنا شروع کر دیا۔ نئی دنیا، اخبار نو، ساز دکن، انگریزی اخبار ملی گزٹ اور دعوت جیسے اخباروں نے میری

تحریروں کو اپنے اخبار میں جگہ دینا شروع کر دیا۔فیض آباد سے جب 'اودھ نامہ' شروع ہوا تو وقار رضوی صاحب نے مجھے اسکی ادارت کی ذمہداری مجھے سونپ دی۔

دوسروں کے بچے پالتے پالتے طبیعت بھر گئی تھی۔ بڑی شدت سے اپنے بچے کی تمنا پیدا ہوچکی تھی۔ سات سال پہلے اللہ نے یہ تمنا بھی پوری کر دی۔'' آپکی طاقت'' کے نام سے ایک ہندی اردو ہفت روزہ میرا بھی نکل آیا جو آج بھی جاری ہے۔گزشتہ سال 'آپکی طاقت' کے نام سے اُردو روزنامہ بھی شروع کردیا۔

صحافی بننے سے پہلے کہانی، افسانہ اور ڈرامہ لکھنے کا شوق میرے بڑے بھائی ڈاکٹر ریاض مہدی اور میری بہن نکہت رضوی کی ہم نشینی نے مجھ میں پیدا کر دیا تھا۔نکہت رضوی اچھی کہانیاں لکھتی ہیں تو ریاض مہدی ایک منجھے ہوئے ڈرامہ نگار ہیں۔ چند سالوں دہلی کی رہائش اور ریڈیو ٹی وی سے وابستگی نے مجھے ٹھیک ٹھاک قلمکار بنا دیا۔ ریڈیو کی اردو سروس اور اردو مجلس نے مجھ سے طنز و مزاح لکھوا کر میری حوصلہ افزائی کی ۔طنز و مزاح پر مبنی مجموعہ ''مجنوں کی واپسی'' جب شائع کرانے کی تمنا جاگی تو انفارمیشن ڈپارٹمنٹ میں ڈائریکٹر اور نیا دور کے سابق ایڈیٹر سید امجد حسین نے بڑھ کر مدد کی ۔فخر الدین علی احمد کمیٹی کے مالی تعان سے 'مجنوں کی واپسی' شائع کرادی ۔اردو اکادمی کو مجنوں کی واپسی پسند آئی تو اس نے اوارڈ سے نواز بھی دیا۔اس طرح ایک قلمکار کا سفر باقاعدہ شروع ہوگیا۔

میرے افسانے اور کہانیاں اگر چہ نیا دور، نے اردو میں قابل اشاعت سمجھا تو ہندی میں 'سرس سلل' جیسے کثیر الاشاعت میگزین نے بھی میری کہانیوں کو اپنے صفحات پر جگہ دی۔ مجنوں کی واپسی کے بعد بابا لئیق اختر فیض آبادی کی قومی آواز میں لکھی 'گلوریاں' کتابی شکل میں چھاپنے میں مصروف ہو گیا۔اس سے فرصت ملی تو ہندی ڈراموں کا مجموعہ 'زمیں دار صاحب' شائع کرنے میں لگ گیا۔ایک عرصہ کے بعد آپکی خدمت میں کہانیوں کا مجموعہ 'باسی روٹی' لیکر پھر حاضر ہوا ہوں

۔مختلف انداز سے کچھ لکھنے کی کوشش کی ہے۔کہیں قلم بہت سنجیدہ ہو گیا ہے تو کہیں کوئی پیغام دینے کی کوشش کی ہے۔کہیں کہیں زیر لب مسکرانے کی باتیں بھی ہیں۔قارئین سے اپنی کاوشوں پر داد کی تمنا نہیں ہے بس اتنی التجا ضرور ہے کہ باسی روٹی کی طرح میری کاوشوں کو سوارت کر دیجئے۔

آپکا اپنا

منظر مہدی فیض آبادی

ڈاکٹر عباس رضا نیر
شعبۂ اردو
لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

منظر نامہ

ہمارا ملک بھارت کتھاؤں اور کہانیوں کا مہاساگر ہے۔ داستان، ناول اور ناولٹ کے عہد سے نکل کر اردو افسانہ بھی یہاں اپنی عمر کی ایک کامیاب پلیٹینم جبلی منا چکا ہے۔ اس ایک صدی میں افسانہ نگاروں نے اردو افسانے میں کون کون سے تجربے نہیں کیے۔ تکنیک اور پلاٹ کے تجربے، آغاز اور انجام کے تجربے، زبان اور بیان کے تجربے، کردار اور کہانی کے تجربے وغیرہ۔ کبھی یہ ہوا کہ تکنیک اور پلاٹ کے بغیر افسانہ لکھا گیا، کبھی کردار اور مکالمے کے بغیر افسانہ لکھا گیا۔ کبھی آغاز اور انجام کے التزام سے انکار کیا گیا، کبھی زبان و بیان میں توڑ پھوڑ کی گئی اور پھر ان سلسلوں کی انتہا کچھ اس طرح ہوئی کہ کہانی سے خود کہانی کو ہی بے دخل کر دیا گیا اور کہا گیا کہ کہانی میں کہانی پن کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ حالانکہ اس ایک صدی کو محیط افسانوی ادب میں پریم چند، منٹو، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، سریندر پرکاش اور نیر مسعود جیسے نام بھی ہیں جنھوں نے اپنی اپنی سطح پر افسانے کی دنیا میں اپنے اپنے طرز کی نئی افسانوی روایت کا آغاز کیا جن کی اہمیتوں کا اعتراف بھی کیا گیا۔ لیکن دوسری طرف ادب کا سیدھا سادہ قاری افسانوں کی رنگا رنگ دنیا میں تجربوں اور جدتوں کے شور شرابوں سے تھک تھکا کر کہانی کے اس روایتی انداز اور فطری اسلوب کو بھی شدت سے یاد کرتا رہا جو کبھی گاؤں کے چوپال میں بیٹھ کر ایک دوسرے کو کہانیاں سنانے والوں میں نظر آتا تھا یا اودھ کے متوسط گھرانوں کی بڑی

بوڑھیاں اپنی مسہری پر بیٹھ کر پوتے، پوتیوں اور نواسے، نواسیوں کو جس انداز میں کبھی کہانیاں سنایا کرتی تھیں وہ انداز جانے کہاں عنقا ہوگا۔ قصہ، کہانی، کردار، آغاز، انجام یہ ساری چیزیں تو اس روایتی انداز میں بھی ہوتی تھیں تو پھر ہمارے نئے کہانی کار اس فطری اور سادے سودے ڈھنگ میں کہانیاں کیوں نہیں بیان کرتے؟ افسانے کے قاری کو بے ضروری تجربوں کی گرم بازاری سے اکتاہٹ سی ہونے لگی ہے.....۔

لیجئے ایک افسانہ نگار اپنے قاری کو نئے تجربات کی چکا چوندھ سے واپس اپنے گاؤں کی پگڈنڈیوں، قصبات کی فضاؤں اور مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبوؤں کی طرف واپس لا رہا ہے اور وہ افسانہ نگار ہے ''منظر مہدی''!

راوی کہتا ہے کہ منظر مہدی نام کا یہ کتھا کار اپنی کہانیوں میں ہیئت اور تکنیک کے اکسپریمنٹ نہیں کرتا، لسانی توڑ پھوڑ کے کرتب بھی نہیں دکھاتا بلکہ روزمرہ کی بات چیت کے لہجے میں چوپال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو اپنے آس پاس کی کہانیاں سناتا ہے اور جو لوگ محبت کرنا بھول گئے ہیں انہیں پھر سے محبت کرنے کے سلیقے سکھاتا ہے۔ اس کے مکالموں کی زبان کس قدر سادی مگر کس قدر پرکار ہے۔:

''خوبصورت لڑکیاں گالیاں دیتی ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے شیشے کی صراحی سے گندا پانی نکل رہا ہو۔''

(ریزہ ریزہ چٹان)

ایک اور مکالمے کے طنز میں کردار کی جھلاہٹ کا لہجہ دیکھئے۔:

''تم نے مجھے تحفے میں چار ماہ کا بچہ دیا تھا، میں تمہیں مہر کے دس لاکھ روپئے دے رہا

ہوں''۔

(محبت کی پہلی قسط)

مکالمے ہی نہیں بیانئے بھی منظر مہدی نے نہایت سادہ اور دل آویز زبان میں لکھے ہیں۔ منظر مہدی کی اپنی زبان دیکھئے۔

''رحمت حسین تحصیل میں کلرک تھے۔ انہیں اللہ نے دولت کے بدلے کثرت اولاد کی نعمت سے مالا مال کیا تھا۔''

(برقعہ والی)

''سادہ کاغذ گن کر بکتا ہے اور چھپا ہوا کاغذ تول کر''۔

(اور وہ صاحب کتاب ہو گئے)

منظر مہدی کے افسانوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ہمیں کسی نئی اور اجنبی دنیا میں نہیں لے جاتے بلکہ ہمارے اردگرد کے ہی چھوٹے چھوٹے مسائل ان کی کہانیوں کا موضوع بنتے ہیں۔ چونکہ ان مسائل سے منظر مہدی کا رشتہ مخلصانہ ہی نہیں والہانہ بھی ہے لہٰذا وہ اپنے قاری کو کسی گہرے تفکر میں غرق کئے بغیر زیریں سطح پر اٹھنے والی لہروں کے تاثر میں باندھ لیتے ہیں۔ منظر مہدی کی زندگی کے بعض بہت چھوٹے چھوٹے تضادات اور تصادمات کو اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہیں اور اس طرح پیش کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی مقصد کی برآوری یا کسی نہ کسی اصلاحی نکتے کی پیغام رسانی میں بھی کامیاب ہو جاتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ان سب کے باوجود کہانی کہانی ہی رہتی ہے کسی واعظ کا خطبہ یا مفتی کا فتویٰ نہیں ہو جاتی۔ اس کی خوبصورت مثال افسانہ ''پیاس'' ہے۔ اس افسانے میں ریحانہ اور عدیل کی ذہنی کشاکش کو پیش کیا گیا ہے۔ عدیل ریحانہ

کا شوہر ہے جو اس کی محبتوں میں ڈوب کر ہر طرح کی الجھنوں سے بے نیاز ہو کر ایک پر سکون اور خوشگوار ازدواجی زندگی جینا چاہتا ہے۔ لیکن ریحانہ اس بات پر اپنا عقیدہ پختہ کر چکی ہے کہ دولت کی گرمی کے بغیر پیار اور محبت میں بھی حرارت نہیں پیدا ہو سکتی۔ لہٰذا وہ چاہتی ہے کہ عدیل سب سے پہلے دبئی جائے اور وہاں سے ڈھیر ساری دولت کما کر اسے بھیجتا رہے۔ چنانچہ عدیل کو دبئی بھیج دیا جاتا ہے۔ ادھر ریحانہ کے دل میں کار اور بنگلے کی خواہش بڑھتی جاتی ہے۔ عدیل جب جب دبئی سے واپس آنے کا پروگرام بناتا ہے ریحانہ اس کے پاس بیش قیمت فرمائشوں بھرا ہوا ایک خط ارسال کر دیتی ہے۔ لیکن ادھر ریحانہ کے دل میں جیسے جیسے دولت سے محبت بڑھتی جاتی ہے وہاں عدیل کے دل میں ویسے ویسے دولت سے نفرت بھی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ آخر کار ایک دن عدیل ریحانہ کے پاس پانچ لاکھ روپئے کے ڈرافٹ کے ساتھ اپنے آخری فیصلے کو تحریری شکل میں ایک خط لکھ کر بھیج دیتا ہے کہ ان پیسوں سے وہ اپنے بنگلے کی بالائی حصے میں چار کمرے تعمیر کرا کے کرائے پر اٹھا دے جن سے ریحانہ اور ریحانہ کی گاڑی کا خرچ نکل آئے گا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی فیصلہ سنا دیتا ہے کہ مجھے میری جیسی ہی ایک سرپھری لڑکی مل گئی ہے وہ میری فرم کے مالک کی بیٹی ہے۔ میری ہی طرح دھن دولت کی خواہش سے بے نیاز ہے۔ میرے ساتھ میرے ملک ہندستان میں ہی دو کمروں کے چھوٹے سے مکان میں رہنے اور میری اسکوٹر پر ہی گھومنے کے لئے راضی ہے۔

منظر مہدی نے اس کہانی کی تمہید اس طرح سے اٹھائی ہے کہ افسانہ اپنے جملے میں ہی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور ہر جملے کے بعد قاری کا تجسس بڑھتا جاتا ہے کہ آگے کیا ہونے والا ہے؟ افسانے کے ابتدائی جملے ہیں:۔

''عدیل کو دبئی گئے ہوئے ابھی صرف پندرہ دن ہوئے تھے لیکن ریحانہ کو ایسا لگ رہا تھا

جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔"

منظر مہدی نے آغاز ہی کی طرح اس کا انجام بھی نہایت کامیابی کے ساتھ کیا ہے۔ کہانی بیانئے پر ختم ہوتی ہے لیکن کہانی کے آخری جملے کہانی ختم ہونے کے بعد بھی اپنے قاری کو اپنی گرفت سے باہر نہیں جانے دیتے۔

"(ریحانہ نے) گھبرا کر لفافہ دور پھینک دیا۔ اسے لگا جیسے وہ ابھی تک ہاتھوں میں انگارے لئے ہوئے تھی۔ خط کا ایک ایک جملہ گھر کی
ایک ایک اینٹ بنکر اس پر برس رہا تھا۔ دور پڑا ہوا پانچ لاکھ کا ڈرافٹ اس کی آرزوں کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا......"

اسی طرح کے تضاد کی بہترین مثال منظر مہدی کا افسانہ "ورجنیٹی ٹسٹ" ہے۔ مرزا ہادی رسوا سے لے کر سعادت حسن منٹو تک ہر ناول نگار اور ہر کہانی کار نے قحبہ خانوں اور طوائفوں کی زندگی کو ادب موضوع بنایا ہے۔ ظاہر ہے موضوع کوئی نیا نہیں ہے۔ لیکن قدروں کو پامال کر کے نہایت تیزی کے ساتھ آگے بڑھتی ہوئی اس دنیا میں منظر مہدی نے ایک شریف اور ایک بدنام زمانہ طبقے کے تضادات نہایت سلیقے سے بے نقاب کیا ہے۔ ساجد ایک اعلیٰ اور شریف خاندان کا چشم و چراغ ہے جو اپنے کالج کی دوست پروین سے پیار کرتا ہے۔ جب کہ اس کی منگنی بچپن میں ہی اس کے ماموں کی بیٹی نجمہ سے ہو چکی ہوتی ہے۔ ساجد نجمہ کے بارے میں اچھی طرح واقف ہے جب کہ پروین کے خاندانی پس منظر سے وہ قطعاً ناواقف ہے۔ جب طبیعت کی خرابی کی وجہ سے ساجد کے ماموں ساجد سے نجمہ کے عقد پر اصرار کرتے ہیں تو وہ پروین کو اپنے حالات بتاتا ہے اور خود اس کے بارے میں اسی سے جاننا چاہتا ہے۔ پروین خاموش رہ جاتی ہے۔ پروین کی

خاموشی سے ساجد کو بدگمانیاں ہونے لگتی ہیں کہ شاید وہ کسی اور کو چاہتی ہے۔ اس بدگمانی کو دور کرنے کے لئے پروین کو اپنی خاموشی توڑنی پڑتی ہے اور تب وہ ساجد کو بتاتی ہے کہ میں تارا بائی کے کوٹھے پر رہتی ہوں۔ بچپن ہی میں مجھے اغوا کرلیا گیا تھا اور اس کوٹھے پر بیچ دیا گیا تھا۔ میری تربیت وہیں ہوئی لیکن میں آج تک پاک و پاکیزہ اور بے داغ ہوں۔ وہ جانتی ہے ساجد کی بھابھی اس معاملے میں اس کی رازدار ہیں اس لئے وہ یہاں تک تیار ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی بھابھی کے ذریعے پروین کے کنوارے پن کی جانچ کرالے۔ ساجد گھر جا کر اپنی بھابھی سے ساری باتیں بتاتا ہے۔ ساجد کی بھابھی نجمہ کو بلا کر بات کرتی ہیں تو نجمہ خود اپنی طرف سے یہ پیش کش رکھتی ہے کہ ساجد اس سے منگنی توڑ دے۔ چونکہ وہ اپنے دوست احمد سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ نجمہ کے اس فیصلے پر جب ساجد کی بھابھی والدین کی رضامندی کی بات کرتی ہیں وہ کہتی کہ والدین کو میرے فیصلہ کی تائید کرنا ہی پڑے گی چونکہ میں احمد کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ کہانی اپنے انجام تک پہنچتے پہنچتے کسی سنسنی کے بغیر حیرت واستعجاب کی ایک فضا قائم کر دیتی ہے۔

منظر مہدی نے رشتوں کے تضادات کی کشمکش کو اپنی کہانی ''باسی روٹی'' میں بھی بڑی کامیابی سے پیش کیا ہے۔ وہ ٹکراؤ جو ساس بہو سے شروع ہو کر سارے رشتوں کو ناسور بنا دیتا ہے اسے منظر مہدی نے کچھ اس طرح پیش کیا ہے کہ جیسے سمندر کی ایک لہر پر گرتے ہی اسے توڑ دیتی ہے اور اس ٹوٹی ہوئی لہر سے دوسری لہر اٹھ جاتی ہے اور پھر ٹوٹتی بکھرتی لہروں کا ایک لامتناہی سلسلہ حد نظر تک پھیل جاتا ہے۔

منظر مہدی نے اپنی کہانیوں کو زبردستی مسرت انگیز یا غم انگیز بنانے کی کوشش نہیں کی

ہے۔ کسی نئی جدت یا نئی بدعت کے چکر میں بھی نہیں پڑے ہیں۔ بس زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل کو ایک معصوم شاعرانہ دل رکھنے والے افسانہ نگار کی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ہاں اس شاعرانہ دل رکھنے والے کتھا کار نے کہیں کہیں اپنی شاعرانہ زبان کے بھی مظاہرے کر دیئے ہیں جنہیں پڑھ کر یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ افسانہ ہے یا انشائیہ! ایسا ایک آدھ افسانے میں ہی ہوا ہے لیکن میں اس پر تبصرہ کر کے منظر مہدی کے قارئین کی چشم خراشی نہیں کرنا چاہتا۔ ویسے بھی منظر مہدی افسانہ نگار ہے شاعر نہیں جسے مشاعرے میں کلام سنانے کے لئے کسی اناؤنسر کی ضرورت درکار ہو۔ مگر ہاں منظر مہدی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے آج کے عہد میں بھی افسانے کی ایک دنیا بسا رکھی ہے۔ اس عہد میں مشاعرے کے سامعین تو پھر بھی موجود ہیں لیکن افسانے کے قارئین ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ ہم افسانے پڑھنے والوں کے حلقے کی بات کرتے ہیں لیکن افسانہ پڑھنے والے بھی تو جبھی پیدا ہوں گے جب افسانہ لکھنے والے ہوں گے۔ منظر مہدی نے اس خسارے کے سودے کو اپنے سر مول لینے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اللہ انہیں ہمت اور حوصلے کے ساتھ کچھ سچے قارئین بھی عطا کرے۔ آمین!

عرض کر چکا ہوں کہ منظر مہدی کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں پھر بھی مناسب ہوگا یہ بتا دینا کہ منظر مہدی کی طنزیہ تحریروں کے مجموعے ''مجنوں کی واپسی'' نے یو پی اردو اکادمی سے بھی انعام حاصل کیا ہے اور عوام سے مقبولیت کے تمغے اکٹھا کیے ہیں۔ ان کے ڈراموں کا ایک مجموعہ ''زمیں دار صاحب'' بھی شائع ہو چکا ہے۔ منظر مہدی ''آپ کی طاقت'' کے نام سے اپنا ایک اخبار بھی نکالتے ہیں۔ اردو پریس ایسوسی ایشن فیض آباد کے صدر بھی ہیں۔ ایک ادبی سماجی اور ثقافتی تنظیم گلدستہ پروڈکشن سوسائٹی کے بانی اور جنرل سکریٹری بھی ہیں۔ مختلف اخباروں

اور رسالوں میں وقتاً فو قتاً آپ کی تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اور یہ سب کچھ کیوں نہ ہو یہ ساری ادبی اور تہذیبی وراثتیں تو انہیں اپنے والد گرامی جناب لئیق اختر فیض آبادی صاحب سے ملی ہیں۔ لیکن ہاں کسی برگد کے سائے میں پروان چڑھتے ہوئے ایک پودے کو اپنی شناخت قائم کرنے میں کتنا خون جگر صرف کرنا پڑتا ہے اس کی مثال خود منظر مہدی ہیں۔ جواب پوری طرح پس منظر سے منظر میں آچکے ہیں۔ لیکن کسی بھی منظر کو جتنی آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے اسی آسانی سے اسے گرفت میں نہیں لیا جا سکتا۔ آج ''باسی روٹی'' کی شکل میں منظر مہدی کے افسانوں کی اشاعت کے موقع پر ایسا لگ رہا ہے جیسے مرحوم لئیق اختر صاحب کی آنکھوں کے خواب تعبیر میں بدل رہے ہوں۔

لئے پالک

کہنے کو تو شنو میاں نواب صفدر رضا کے بڑے بیٹے اور گھر کے ذمہ دار تھے لیکن، حقیقت میں صفدر ولا کی جان ڈاکٹر منصور تھے۔نواب صاحب کی جائداد سے لے کر بیگم صاحبہ کے گٹھیا کے مرض تک کا علاج ڈاکٹر منصور کے پاس تھا۔ان کی دخل اندازی کے بغیر صفدر ولا کا کوئی بھی کام پورا نہیں ہو پاتا تھا۔

اسپتال سے آتے ہی منصور کی پکار ہر طرف شروع ہو جاتی۔سب سے پہلے بیگم صاحبہ اپنے مرض کی تفصیل بتاتیں۔انہیں تسلی اور دوائیں دے کر مہلت پاتے تو نواب صاحب کے کمرے میں حاضری ہوتی۔نواب صاحب اپنی جائداد کے نقشے لئے بیٹھے ہوتے۔وہاں سے فرصت ملتی تو طلعت بیگم آگھیرتیں۔"منصور بھائی تھوڑی انگریزی پڑھا دیجئے۔امتحان بالکل سر پر ہے۔" وہ لاکھ بہانے بناتے مگر طلعت بیگم کہاں ٹلنے والی تھیں۔یہ تھی منصور میاں کی زندگی۔

نواب صاحب کے ایک بہت ہی وفادار منشی شوکت حسین تھے۔تھے تو وہ منشی جی لیکن نواب صاحب انہیں اپنے دوستوں میں گنتے تھے۔یہی حال منشیائن یعنی منشی جی کی بیوی کا تھا۔وہ گھر میں سیدانی بی بی کہلاتی تھیں۔صفدر ولا کے بچوں کو دینی تعلیم دینا انکی ذمہ داری تھی۔صفدر ولا سے کچھ دوری پر منشی جی اپنے بیوی بچے کے ساتھ رہتے تھے۔منصور اس چھوٹے سے کنبہ کا اجالا تھے۔

سیدانی بی بی جب صفدر ولا میں بچوں کو پڑھانے آتیں تو منصور بھی ان کے ہمراہ چلا آتا۔

چونکہ منصور شہنواز کا ہم عمر تھا اس لئے دونوں ایک دوسرے کے گہرے دوست تھے۔ یہ خوبصورت سا صاف ستھرا بچہ نواب صاحب کو بھی بہت پسند تھا۔ وہ اکثر منصور کو اپنے پاس بلا کر باتیں کیا کرتے تھے۔

منشی جی نواب صاحب کے بہت قریب اور ان کی جائداد کے تنہا نگراں تھے۔ چاہتے تو اپنے لئے کوٹھیاں کھڑی کر لیتے لیکن غیرت اور خوداری اس حد تک تھی کہ کبھی ایک تنکے کا بھی سوال نہیں کیا بلکہ نواب صاحب اگر کبھی کوئی پیشکش بھی کرتے تو وہ اسے ٹھکرا دیتے۔ بیوی بھی ایسی ملی تھیں جو غیرت کا پتلا تھیں۔ وہ صفدر ولا میں پڑھانے جاتیں تو اس بات کا خیال رکھتیں کہ کھانے اور ناشتے کا وقت نہ ہو۔ اگر بیگم صاحبہ کبھی کھانے پر روکتیں تو وہ انکار کر دیتیں۔ ایسے ماں باپ کا بچہ بھلا بے غیرت کیسے ہو سکتا ہے۔ شہنواز کے ساتھ کھیلتے ہوئے منصور بھولے سے بھی کسی چیز پر نظر نہیں ڈالتے تھے۔ منشی جی کے گھرانے کی خوداری اور رکھ رکھاؤ سے نواب صاحب کا خاندان بہت متاثر تھا۔ گھر کی ہر چھوٹی بڑی تقریب میں منشی جی کو خاص طور سے مدعو کیا جاتا۔

نیک لوگوں کی زندگی بہت کم ہوتی ہے اس لئے منشی جی بھی بہت تھوڑی سی زندگی لے کر آئے تھے۔ ایک معمولی سے دل کے دورے نے ان کی سانسوں کی ڈور کاٹ دی۔ سیدانی بی بی کی زندگی میں اندھیرا پھیل گیا۔ نواب صاحب نے بھی دوست کے بچھڑ جانے کا بہت اثر لیا۔ انہوں نے سیدانی بی بی سے صفدر ولا میں رہنے کی بات بھی کی لیکن وہ اس پر تیار نہ ہوئیں۔ بس اتنا کہا، ''نواب صاحب بن باپ کے بچے کی پرورش غربت میں ہو تو بچہ بڑا ہو کر ہونہار نکلتا ہے۔'' نواب صاحب سیدانی بی بی کے مزاج سے واقف تھے اس لئے زیادہ اصرار نہ کیا۔

وقت کا پہیا چلتا رہا۔ غربت کی دھوپ اور ممتا کی چھاؤں میں منصور پلتے رہے۔ لیکن شوہر کے گزر جانے کے بعد سیدانی بی بی کچھ ٹوٹ سی گئی تھیں۔ وہ اپنے کو بہت دنوں تک کھینچ نہ سکیں۔ تھوڑے دن کی بیماری کے بعد وہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔

چودہ پندرہ سال کے منصور کو نواب صاحب صفدر ولا لے آئے اور منصور بھی گھر کے ایک فرد کی طرح رہنے لگے۔ شہنواز کی طرح وہ بھی نواب صاحب کو نواب ابا پکارتے۔

نواب صاحب کو شروع سے منصور سے لگاؤ تھا۔ اب تو وہ ان ہی کی سرپرستی میں پل رہے تھے۔ اس لئے ان کی تعلیم ان کے رہن سہن پر نواب صاحب کی خاص توجہ رہتی تھی۔ شہنواز کے ساتھ منصور بھی اسکول جانے لگے۔

نواب صاحب کی ان ساری مہربانیوں کے باوجود منصور کے انداز میں ذرا سی بھی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ ہمیشہ اس بات کو یاد رکھتے کہ وہ منشی جی اور سیدانی بی بی جیسے غیرت دار ماں باپ کے بیٹے ہیں۔ خودداری اور رکھ رکھاؤ ہی ان کا اصل سرمایا ہے۔ اور اسی بات نے ان کو سب سے اچھا مقام دلوایا تھا۔

منصور پڑھائی میں شہنواز کے مقابلے کہیں آگے تھے۔ کلاس میں ہمیشہ فرسٹ آتے نواب صاحب شہنواز کی بے راہ روی سے پریشان تھے لیکن انہیں منصور کا انداز بہت پسند تھا۔

منصور کی یہ خواہش تھی کہ جلد از جلد پڑھائی ختم کر کے کہیں نوکری کرلیں تا کہ نواب صاحب کے مزید احسانوں سے وہ بچ جائیں۔ لیکن نواب صاحب شہنواز کے رنگ ڈھنگ سے اس حد تک بددل ہو چکے تھے کہ ان کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ اب ان کی ساری تمناؤں کا مرکز منصور تھے۔ جب انہیں منصور کے نوکری کرنے کے خیال کا پتہ لگا تو کہنے لگے کہ میں تو تمہیں ڈاکٹر بنانا چاہتا ہوں اور تم نوکری کی بات سوچ رہے ہو۔ نوکری کے لئے تو پوری زندگی پڑی ہے ابھی تم صرف پڑھائی پوری کرو۔ ہاں اگر کچھ پیسوں کی ضرورت ہو تو ضرور کہو۔

منصور نواب صاحب کی بات سن کر بہت شرمندہ ہوئے۔ سر جھکا کر کہنے لگے نواب ابا مجھے یہاں نہ تو کسی چیز کی ضرورت ہے اور نہ ہی تکلیف لیکن میں نہیں چاہتا ہوں کہ آپ کی محبت اس حد تک ہو جائے کہ اسے میں احسان سمجھنے لگوں۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد نواب صاحب نے بھرائی

ہوئی آواز میں کہا ''میری محبت میں یقیناً کچھ کمی رہ گئی ہے جس کی وجہ سے تم نے اس بے گانے پن سے بات کی ہے۔ منصور بیٹے تم پکارتے تو نواب ابا ہو اور باتیں غیروں کی طرح کرتے ہو۔ آج کے بعد کبھی بھی اس قسم کا خیال تک دل میں نہ آئے۔ منصور نے اس کے بعد کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے نواب صاحب کے دل کو ٹھیس پہنچے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی صفدر ولا کے لئے وقف کر دی۔

شہنواز چونکہ روز بروز بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے اس لئے جائداد کا سارا حساب و کتاب ڈاکٹر منصور دیکھتے تھے۔ نواب صاحب برائے نام دخل دیتے تھے۔ لمبے چوڑے خوبصورت سے ڈاکٹر منصور صفدر ولا کا محور بن گئے تھے۔ صفدر ولا کی ہر ذات کسی نہ کسی انداز میں ان سے جڑی ہوئی تھی۔

ادھر کچھ دنوں سے گھر میں اٹھنے والے طوفان کو وہ دیکھ رہے تھے۔ لیکن لاکھ کوششوں کے باوجود انہیں اس کا رخ موڑنے میں کامیابی نہیں مل رہی تھی۔ طلعت بیگم کے امتحان قریب تھے لیکن پڑھائی میں ان کی ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ کتابیں تو لے کر پابندی کے ساتھ منصور کے پاس آتیں لیکن جب تک منصور ان کو پڑھاتے رہتے وہ منصور کے چہرے کو تکا کرتیں یا کاپی پر خالی لکیریں کھینچا کرتیں۔ منصور جب ان کی اس لاپرواہی اور بے توجہی پر ان کو ٹوکتے تو وہ بڑی حسرت سے کہتیں ''منصور صاحب ڈاکٹر تو حال سن کر ہی مرض کی پہچان کر لیتے ہیں آپ کیسے ڈاکٹر ہیں جو اتنا قریب رہنے پر بھی مرض نہیں پہچان رہے ہیں''۔ منصور جب پڑھ رہے تھے تبھی سے انہیں طلعت پسند تھیں لیکن کسی معمولی جذبے کے اظہار سے وہ اپنے وقار اور خودداری کو چوٹ نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے بڑی بے دردی سے اس جذبہ کو کچل دیا تھا۔ مگر انہیں اب طلعت کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ بھی انہیں بہت دنوں سے اپنے دل میں بسائے ہوئے ہیں اور پڑھائی تو بس ایک بہانہ تھا ان کے بنائے ہوئے قلعے کے اندر آنے کا۔ منصور طلعت کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے بڑی نرمی سے سمجھاتے نواب زادی طلعت رضا جن کی راہوں میں سیکڑوں سورج روشنی بکھیرنے کے لئے تیار

ہوں وہ کسی ستارے سے اجالے کی تمنا کرے یہ بات مناسب نہیں لگتی۔ میرا ساتھ آپ کے شایان شان نہیں ہے آپ اپنی راہیں بدل لیں۔

بچپن سے لے کر آج تک اگر میری کسی بات میں آپ کو نوابی جھلک ملی ہو تو آپ کا یہ کہنا ٹھیک تھا۔ لیکن یہاں تو جب سے ہوش سنبھالا صرف آپ ہی میرے خیالوں میں رہے۔ اس لئے میں نے خود کو آپ کی پرچھائیں بنا کر رکھا ہے۔ اس کے باوجود آپ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ یہ کہہ کر طلعت کی آنکھوں میں آنسوں آجاتے اور وہ اٹھ کر چلی جاتی۔ ادھر منصور کے دل پر جو بھی بیتتی اسے کوئی نہیں دیکھ پاتا۔

منصور نے جب یہ دیکھا کہ طلعت اب بہت آگے بڑھ چکی ہے کہ اس کا پیچھے پلٹنا مشکل ہے تو انہوں نے خود کنارہ کشی اختیار کرنی شروع کر دی۔ وہ دیر سے گھر آتے تاکہ طلعت کی پڑھائی کا وقت نکل جائے یا اگر جلدی آبھی گئے تو نواب صاحب کے پاس جا کر بیٹھ جاتے۔

منصور کی یہ بے رخی طلعت برداشت نہ کر سکیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سخت بیمار پڑ گئیں۔ اب تو مجبوراً منصور کو ہی دیکھنا پڑا۔ وہ طلعت کے پاس جاتے دوائیں دیتے اور خوش رہنے کی تاکید کر کے چلے آتے۔ جواب میں طلعت کے ہونٹوں پر ایک بے جان سی مسکراہٹ آجاتی۔

ایک دن منصور طلعت کا بخار چیک کرنے اس کے کمرے میں گئے تو طلعت بستر پر لیٹی چھت کو تک رہی تھی۔ انہوں نے حسب معمول تھرمامیٹر منھ میں رکھنا چاہا تو طلعت نے منصور کا ہاتھ پکڑ لیا۔ میری خطا یہی ہے نہ کہ میں ایک نواب کی بیٹی ہوں۔ بتایئے اس میں میرا کیا قصور ہے؟ کیا نواب کی بیٹیوں کو کسی کو چاہنے کا حق نہیں ہوتا۔

منصور نے بہت دھیرے سے اپنا ہاتھ چھڑایا دیکھو میں بھی ایک انسان ہوں میرے سینے میں بھی ایک دل دھڑکتا ہے۔ میں کوئی فرشتہ نہیں ہوں جو ہر جذبات اور احساسات سے خالی ہوتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ نواب صاحب کبھی سوچیں کہ میں نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر کوئی تمنا کی ہی

ہے۔اس لئے بہتر یہ ہے کہ تم مجھے بھول جاؤ۔

صرف ایک بات بتا دیجئے کیا آپ کے دل میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں ہے؟ اپنائیت کی ایک دھڑکن بھی آپ کے دل میں نہیں ہے۔''طلو'' صفدر ولا کے بے جان ذروں سے بھی مجھے محبت ہے تم تو یہاں کا ایک جاندار پھول ہو۔بس اسی ایک جملے نے طلعت کی زندگی میں بے شمار شہنائیاں بجادیں۔ان کے چہرے پر پھیلنے والے خوبصورت رنگوں کو نہ صرف منصور نے دیکھا بلکہ پورے صفدر ولا نے دیکھ لیا۔

طلعت جب خوشیوں کے اس انمول خزانے کو اکیلے نہ سمیٹ سکی تو آپا بی کو راز دار بنالیا۔آپا بی طلعت کی بڑی بہن تھیں اور منصور کی پرکشش شخصیت سے وہ خود بھی بہت متاثر تھیں۔لہٰذا انہیں کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ان کی نظر میں طلعت کے لئے منصور سے اچھا جیون ساتھی اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

ڈاکٹر منصور جب دالان سے گزر رہے تھے تب انہوں نے بیگم صاحبہ کے کمرے سے آتی ہوئی آپا بی کی آواز سنی۔'نواب ابا طلعت کے لئے منصور سے بہتر رشتہ آپ کو نہیں ملے گا'۔اس کے جواب میں نواب صاحب کی گرجدار آواز بھی سنائی دی۔'نکہت تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے جو ایسی فضول باتیں کر رہی ہو۔نواب زادوں کے رشتوں کو چھوڑ کر کیا میں اپنی نازوں میں پلی بیٹی کو منصور سے بیاہ دوں گا'۔'نواب ابا طلعت اور منصور ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہیں'۔'کیا کہا اس کی یہ ہمت، ہمارے ٹکڑوں پر پلے ہوئے لئے پالک کی یہ مجال کہ وہ ہماری دامادی کے خواب دیکھ رہا ہے'۔

اس کے آگے منصور نہ سن سکے۔کب وہ اپنے کمرے میں آئے اور بستر پر گرے اس کا بھی انہیں ہوش نہ تھا۔منصور نے خواب میں بھی نواب صاحب کے اس روپ کے بارے میں نہ سوچا تھا۔ان کے منہ سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ نے منصور کے دل ودماغ کے ساتھ ساتھ ان کی روح تک کو زخمی کر دیا تھا۔تین چار گھنٹے بے سدھ پڑے رہنے کے بعد جب ان کی طبیعت کچھ معمول پر

آئی تو نواب صاحب کے نام ایک خط اور کچھ کاغذات نوکر کے ہاتھ ان کے پاس بھجوا دیا۔

بیگم صاحبہ کے کمرے میں نواب صاحب اپنی بیٹیوں کے ساتھ موجود تھے جس وقت نوکر نے منصور کا دیا ہوا لفافہ پیش کیا۔ نواب صاحب نے لفافے کو چاک کیا تو سب سے پہلے جائداد کے کاغذات اور ساڑھے تین لاکھ کی رقم کے چیک پر نظر پڑی۔ اس کے بعد منصور کا لکھا ہوا خط تھا جو چند سطروں پر مشتمل تھا۔ محترم نواب صاحب!

نواب ابا کہنے کی جسارت ایک لئے پالک نہیں کر سکتا ہے اس لئے اس طرح مخاطب کرنے پر معاف کیجئے گا۔ آپ کی جائداذ کے کاغذات اور ساڑھے تین لاکھ کی معمولی سی رقم جو مجھے بشکل تنخواہ ملتی رہی ہے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں قبول فرمائیں۔ آپ کے ساتھ رہ کر کبھی اس میں سے ایک پیسہ بھی خرچ کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس لئے پوری تنخواہ بینک میں جمع کرتا رہا۔ یہ نوکری اور یہ تنخواہ آپ کی عنایتوں کی دین ہے اس لئے اس پر آپ کا ہی حق ہے۔ آپ نے مجھے اس قابل بنا دیا ہے کہ صفدر ولا سے دور رہ کر بھی بغیر بھیک مانگے زندگی گزار سکتا ہوں۔ خدا حافظ آپ کا لئے پالک منصور۔

اس خط کو پڑھنے کے بعد نواب صاحب اپنے آپ کو بہت معمولی اور گھٹیا انسان تصور کرنے لگے۔ جبکہ منصور اتنے اونچے نظر آئے کہ وہاں پہنچنا نواب صاحب کے بس میں نہیں تھا۔ انہیں اپنی دوپہر کی گھٹیا گفتگو پر سخت شرمندگی محسوس ہوئی۔ نواب صاحب نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ وہ خود جا کر منصور سے اپنے رویے کی معافی مانگیں گے۔ وہ کسی سے کچھ کہے بغیر اٹھے اور منصور کے کمرے میں آ گئے۔ لیکن اب یہاں منصور کی یادوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔۔۔

مور کے پاؤں

پسینے میں ڈوبی ہوئی ریحانہ نے گھڑی پر نظر ڈالی تو دیکھا گھڑی کی سوئیاں تین بجا رہی ہیں۔ اف فوہ ! ابھی تو صرف کچن کا کام ہی ہوا ہے، نہا دھو کر جمال کی بیوی کو دیکھنے اسپتال بھی جانا ہے جہاں اس نے ایک بیٹی کو جنم دیا ہے۔ اسپتال سے واپسی پر کیک بھی خریدنا ہے۔

آج ریحانہ اور سلمان کی شادی کی ساتویں سالگرہ ہے اور سلمان صاحب کا حکم ہے کہ سالگرہ کی ساری ذمہ داری بیگم صاحبہ اٹھائیں گی اور سلمان صاحب خود نئے نویلے دولہا کی طرح سج دھج کر شام کی پارٹی میں شریک ہونگے۔ بے چارے دن بھر بینک کے کاموں میں الجھے بھی تو رہتے ہیں۔ تھک جاتے ہونگے۔ سلمان کی یاد آتے ہی ریحانہ کے دل میں محبت کے چشمے پھوٹ پڑے۔ ایسا چاہنے والا اور شاندار شوہر شاید ہی کسی کو نصیب ہوا ہو۔

ریحانہ اپنے آپ کو خوش نصیب عورتوں کی لسٹ میں رکھتی تھی۔ اللہ نے اسے اس گھر میں بہت عزت دے رکھی تھی۔ سبھی اس کے مرید تھے۔ دو بھائیوں سلمان اور جمال کا یہ گھر اس کی اپنی ذات پر ٹکا ہوا تھا۔ دونوں بھائیوں میں اگر بے انتہا محبت تھی تو جمال کی دلہن رانی کو وہ بہن کی طرح چاہتی تھی اور رانی نے بھی کبھی اس کے اقتدار کو حسد کی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا۔

جمال دوا کی ایک کمپنی میں ایریا مینیجر تھا تو سلمان بینک میں مینیجر تھے۔ اللہ نے ضرورت کی ہر چیز دے رکھی تھی گھر کا ماحول بھی اتنا پیارا تھا کہ دوسرے دیکھ کر رشک کرتے تھے۔ اگر کمی تھی تو بس ریحانہ اور سلمان کے گلشن میں ایک پھول کی۔ شادی کے سات سال بعد بھی دونوں اولاد کے

سکھ سے محروم تھے۔ بڑے سے بڑے ڈاکٹر نے دونوں کو ایک شاندار اور مکمل جوڑے کی سند دی تھی۔ سب یہی کہتے تھے کہ اس میں اللہ کی مصلحت ہے اور کچھ نہیں۔

گھر کے سونے پن کو جمال کے چار بچوں نے دور کر دیا تھا۔ شادی کے پانچ سالوں میں ہر سال رانی اور جمال نے اس گھر کو ایک پھول سے سجایا تھا۔ شاید بیٹی کی تمنا میں چار بیٹے ہو گئے تھے۔ آج اللہ نے انہیں ایک بیٹی دے کر ان کی فیملی کو مکمل کر دیا تھا۔

ریحانہ نے جمال کے بچوں کو ہی اب اپنے بچے مان لئے تھے۔ وہ ان بچوں کا رانی سے زیادہ خیال رکھتی تھی۔ لیکن اپنا بچہ نہ ہونے کی کسک کو بھی وہ ختم نہیں کر پا رہی تھی۔ کبھی کبھی لاولد ہونے کی ٹیس بہت زور سے اٹھتی تھی۔ یہ ٹیس اس وقت بہت زیادہ ہوتی جب رانی کے یہاں ولادت ہوتی۔

کل رات میں رانی کو لے کر وہ اسپتال گئی تھی۔ رات بھر اس کے ساتھ جاگتی رہی۔ فجر کے وقت رانی نے ایک بچی کو جنم دیا۔ جب دونوں ماں بیٹی سو گئیں اور ڈاکٹر نے ان کے صحت مند ہونے کا اطمینان دلا دیا تب وہ گھر آئی۔ گھر میں بہت کام تھا اسپتال کی ذمہ داری کے ساتھ اپنی شادی کی سال گرہ کا بھی انتظام دیکھنا تھا۔

ریحانہ تولیہ اٹھا کر جھٹ سے باتھ روم میں گھس گئی۔ آدھا گھنٹہ شاور کے نیچے ٹھنڈے پانی سے نہانے کے بعد اس کی طبیعت کافی حد تک خوشگوار ہو گئی۔ بالوں کو پوچھتی ہوئی وہ ڈریسنگ ٹیبل کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ اپنی اور سلمان کی شادی کی خوبصورت سی تصویر دیکھ کر پھر اس کا ذہن بھٹکنے لگا۔ ہم دونوں کو اوپر والے نے بڑی فرصت سے بنایا ہے۔ سلمان اگر مردانی خوبصورتی کا بہترین نمونہ تھے تو وہ بھی کسی پری سے کم نہ تھی۔ کالج میں ہر سال اسی کو مس کالج کا خطاب ملتا تھا۔ شادی کے

بعد ایک فنکشن میں دونوں نے بہترین جوڑے کا خطاب جیتا تھا۔ لیکن ابھی تک اس کی اپنی کوکھ نے اسے ایک بھی انعام نہیں دیا تھا۔

کیا وقت اسی طرح گزر جائے گا اور میری کوکھ سونی رہ جائے گی؟ کیا سلمان اس محرومی کو ہمیشہ برداشت کر پائیں گے۔ وہ مجھے چھوڑ تو نہیں دیں گے؟ ان سارے سوالوں کے جواب وہ اپنے وجود میں ڈھونڈنے لگی۔ اس نے غور سے اپنے چہرے کو دیکھا بڑی بڑی جھیل جیسی آنکھیں، نازک سے ہونٹھ، چھوٹا سا دہانہ، سرخ سفید گالوں کے بیچ ستواں ناک ایسا حسین چہرہ کہ جسے دیکھ کر فرشتوں کے قدم بھی بہک جائیں۔ عمر کے ۲۷ سال جیسے اس پر سے نہیں کہیں پڑوس سے گزرے ہوں۔

اپنے حسن پر خود نظر لگاتے ہوئے اس نے اپنے گاؤن کی ڈوری کھول دی۔ سیاہ لباس کے اندر سے روشنی کا ایک چھنا کا سا ہوا۔ سنگ مرمر سا تراشہ ہوا حسن کی دیوی کا برہنہ جسم اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ اپنے جسم کو دیکھ کر وہ خود ہی شرما گئی۔ ایسا لگ ہی نہیں رہا تھا کہ کسی شادی شدہ عورت کا جسم ہے۔ آج بھی وہ کسی لمس سے آری ایک تر و تازہ کلی کی طرح جوان تھی۔ اپنے بے پناہ حسن میں اسے سب سے بدصورت چیز کوئی نظر آئی تو وہ اس کی کوکھ تھی جو سات سال میں اسے ایک بچہ بھی نہ دے سکی۔ اسے بے ساختہ مور یاد آ گیا جس کا پورا جسم تو بے انتہا حسین ہوتا ہے لیکن پیر انتہا کی حد تک بدصورت ہوتے ہیں۔ شائد اللہ کا یہی انصاف ہے کہ وہ کسی ایک کو سب کچھ نہیں دیتا۔

'کیا بھابھی آپ اسپتال...' کمرے میں ایکدم سے داخل ہوتے ہوئے جمال کے منھ میں تالا لگ گیا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں حسن کی دیوی کا عکس اسے پاگل کر دینے کے لئے کافی تھا۔ اس سے پہلے کہ ریحانہ اپنے گاؤن کی ڈوری باندھ پاتی جمال اسے اپنی باہوں میں بھر چکا تھا۔ بھابھی تم کتنی حسین ہو۔ میں نے آج تک اس بلا کی خوبصورتی نہیں دیکھی۔

ریحانہ کے حواس جب تک قابو میں آتے تب تک جمال نے اسے قریب پڑے ہوئے

بیڈ پر لٹا دیا۔ ریحانہ نے اپنے کو آزاد کرانے کے لئے جمال پر مکوں کی بارش کر دی لیکن جمال ریحانہ کے برہنہ بدن کو دیکھ کر پاگل ہوا جا رہا تھا اور ریحانہ کے گھوسوں کے جواب میں اسے بے تحاشہ چومے جا رہا تھا۔

ریحانہ کے ذہن میں اچانک یہ خیال آیا کہ جمال اسے ایک بچہ دے سکتا ہے اور اس کی سونی زندگی میں بہار آسکتی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی وہی ہاتھ جو اب تک جمال پر مکے برسا رہے تھے اس کی کمر کے گرد حلقہ بن گئے اور وہ بے سدھ ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد جب جمال کی موٹر سائیکل کی آواز دور جانے لگی تب وہ اٹھی اور پھر باتھ روم میں چلی گئی۔

بچے کی امید نے جہاں اسے بہت ساری خوشیاں دی تھیں وہیں اسے احساس گناہ بھی تھا۔ وہ اپنے آپ کو سمجھاتی کہ اس میں اس کا کیا قصور ہے۔ اس نے جمال کو دعوت تو نہیں دی تھی۔ اس نے تو جمال کو کبھی غلط نگاہ سے دیکھا بھی نہ تھا۔ جو کچھ بھی ہوا اچانک ہی ہو گیا۔

اپنے گناہ کے بوجھ کو کم کرنے کے لئے اور اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی غرض سے اس رات وہ سلمان کے ساتھ اس طرح پیش آئی جیسے زندگی میں پہلی بار سلمان اس سے ملا ہو۔ سلمان اس کی گرم جوشی پر مسرور بھی ہو رہا تھا اور حیرت زدہ بھی۔ خود سپردگی کے اس والہانہ انداز پر سلمان نے اسے باہوں میں بھر کر پوچھا بھی کہ آج جان لینے کا ارادہ ہے کیا؟ اس پر اس نے بڑی قاتل ادا سے کہا تھا کہ آج کی رات کو ایک یادگار رات بنانا ہے۔

ٹھیک نو مہینے کے بعد ریحانہ نے ایک چاند سی بیٹی کو جنم دیا۔ سارے گھر نے خوشیاں منائیں۔ سلمان کے لئے تو جیسے عید کا دن ہو۔ ایک لمبے عرصہ کے بعد اپنی اولاد جو ہوئی تھی۔ لیکن

ریحانہ اُس طرح سے خوش نہ ہوسکی جس طرح سے دیگرافرادخانہ خوش تھے۔ بچی پر جب بھی نظر پڑتی اسے سالگرہ والی رات کے بجائے اس دن کی دوپہر کی یاد آجاتی۔

وقت گزرتا گیا ریحانہ کی بیٹی چاندنی بھی بڑی ہوتی گئی۔ گورے چٹے ماں باپ کی بیٹی نہ جانے کہاں سے سانولا رنگ لے آئی تھی۔ چہرے پر جمال کی مشابہت زیادہ تھی۔ خاص طور پر آنکھیں تو بالکل جمال جیسی تھیں۔ اوراس کی سب سے بڑی کشش بھی یہی تھی کیوں کہ جمال کی آنکھیں بہت خوبصورت تھیں۔

دونوں بھائیوں کی محبت نے اگلی نسل تک رواداری قائم رکھی لیکن اب انداز بدل گئے تھے۔ جمال کے بڑے بیٹے فراز اور چاندنی کے درمیان جس طرح کے رشتہ کا آغاز ہوا اس سے گھر کا ایک ایک فرد خوش تھا سوائے ریحانہ کے۔

ایک باپ کی دو اولادوں کے بیچ کس طرح شادی ہوسکتی ہے؟ ریحانہ نے کئی بار چاندنی اور اور فراز دونوں کو سمجھایا مگر دونوں کے سمجھ میں آنیوالی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ دونوں پڑھے لکھے تھے۔ ایک ہی خاندان کے تھے۔ پورا گھر اس رشتہ سے راضی تھا پھر شادی میں کیا قباحت تھی۔ اب ریحانہ کیسے انہیں بتاتی کہ اس کی زندگی کا ایک واقعہ اس کے لئے ناسور بنا ہوا ہے۔ اے میرے مالک! کیا میں بھائی بہن کی شادی کرا کے اپنے گناہوں میں اضافہ کرلوں۔ نہیں میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتی۔ پھر اپنے بچوں کے سامنے اپنے ماضی کو ننگا کرنا ہوگا۔ پروردگار وہ تو اور بھی مشکل کام ہے۔ جوانی کی لغزشوں کو بے نقاب کرنے سے بہتر ہے کہ میں اپنا وجود ہی ختم کرلوں۔ یہی سب سوچتی ہوئی وہ جمال کے کمرے تک آگئی۔

آج بیس سال بعد وہ جمال کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اس واقعہ کے بعد سے

دونوں کے بیچ میں اتنی دوری ہو گئی تھی کہ صرف ضرورت پڑنے پر ہی بات کرتے تھے۔ جمال کی بیوی رانی کا چار سال پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ اب جمال کمرے میں تنہا رہتے تھے۔ جمال میز پر جھکے ہوئے کچھ لکھ رہے تھے۔ جب ریحانہ بوجھل قدموں سے ان کی طرف بڑھی تو ریحانہ کو دیکھ کر جمال فوراً کھڑے ہو گئے۔ 'کیا بھابھی خیریت اتنی رات میں آپ؟'' ہاں بیس سال پہلے جو واقعہ دن میں رونما ہوا تھا اسے رات میں یاد دلانے آئی ہوں۔ کیا گناہ کا یہ سلسلہ ہمیشہ چلتا رہے گا؟' ریحانہ نے جمال سے نظریں چراتے ہوئے کہا، ''میں سمجھا نہیں آپ کیا کہہ رہی ہیں''۔ ویسے اس حادثہ کے لئے میں ابھی تک شرمندہ ہوں۔ جمال نے ندامت بھرے لہجہ میں صفائی پیش کی۔

تمہاری شرمندگی سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اب یہ سوچو کہ آئندہ شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔ جمال نے ریحانہ کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا کہ' آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟' بس اتنا کہ فراز تمہارا بیٹا ہے اور چاندنی بھی تمہاری۔۔۔ اولاد ہے دونوں کی شادی کیسے ہو سکتی ہے؟' ریحانہ نے ہکلاتے ہوئے بات پوری کر دی۔

جمال نے بڑے سکون سے کہا کہ' آپ کا خیال غلط ہے چاندنی میری بیٹی نہیں ہے۔'' یہ کیسے کہہ رہے ہو چاندنی تمہاری بیٹی نہیں ہے۔ اگر تمہیں وہ دوپہر یاد نہیں تو چاندنی کے نقوش غور سے دیکھو ہو بہو تمہارے جیسے ہیں۔ اس کی عادتیں اس کا انداز سب تمہاری طرح ہے۔'

'یہ سچ ہے کہ چاندنی کو دیکھ کر کوئی بھی کہہ دیگا کہ وہ میری کاربن کاپی ہے پھر بھی وہ میرا خون نہیں ہے۔' جمال کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا۔ 'تم کہنا کیا چاہ رہے ہو'۔ ریحانہ جھنجھلا گئی۔ 'یہی کہ بیس سال پہلے آپ کی عزت سے کھیلنے کا گناہ میں نے ضرور کیا تھا جس کے لئے میں پوری عمر شرمندہ رہوں گا۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجئے گا لیکن رہی چاندنی کی بات تو اس وقت بچہ پیدا

کرنے کی میری صلاحیت ختم ہو چکی تھی۔" اپنی بیٹی شازیہ کی پیدائش سے چھ ماہ پہلے میں نے آپریشن کرالیا تھا۔ چونکہ رانی کا تین بار سیزیرئین ہو چکا تھا اس لئے آگے بچے کی پیدائش روکنے کے لئے مجھے اپنا آپریشن کرانا پڑا تھا۔"

جمال نے اپنی میز کی دراز سے اسپتال کا سرٹیفکیٹ نکال کر ریحانہ کے سامنے رکھ دیا۔ جس سے اس کی بات کی تصدیق ہوگئی۔ جمال نے سرٹیفکیٹ کیا دکھایا مانو ریحانہ کو جنت کا پروانہ دکھا دیا۔ بیس سال سے وہ جس کرب سے گزر رہی تھی وہ پل بھر میں دور ہوگئی۔ وہ تیز قدموں سے چلتے ہوئے چاندی کے کمرے میں آئی جہاں وہ ہر الجھنوں سے دور بے خبر سو رہی تھی۔ ریحانہ بے اختیار اسے چومنے لگی۔۔۔

شجرہ تلاش کرنے کا نیا نسخہ

خان صاحب کی چنگیزی مونچھوں کے نیچے جب چوتھے دن بھی میں نے سبزے کو اگے ہوئے دیکھا تو پوچھ بیٹھا بھائی ''سب خیریت تو ہے صاف ستھرے چہرے پر آپ جو فصل تیار کر رہے ہیں اس کی ضرورت تو رمضان شریف میں پڑے گی جو ابھی بہت دور ہے۔'' خان صاحب نے اپنی نوزائدہ داڑھی پر بڑی محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا'' آپ کو خبر نہیں ہے کہ رمضان شریف سے زیادہ الکشن شریف میں داڑھیوں کی مانگ بڑھ جاتی ہے۔ ہر پارٹی کے امیدوار کو پریس کانفرنس کے لئے ، میڈیا کے سامنے بیانات دینے کے لئے جلوسوں میں ساتھ چلنے کے لئے داڑھی والے مسلمانوں کی سخت ضرورت پیش آتی ہے۔ اس بار میں بھی آپ کو کسی کی گاڑی کی زینت بنا ہوا نظر آؤں گا۔''

'کیا آپ مسلمانوں کو اتنا بیوقوف سمجھتے ہیں کہ وہ یہ دیکھ کر ووٹ دیتے ہیں کہ کس کے ساتھ زیادہ داڑھیاں ہیں۔'' ''میں تو بیوقوف نہیں سمجھتا لیکن یہ سیاسی پارٹیاں بیوقوف سمجھتی ہیں۔ میری مونچھ کتنی ہی گھنی کیوں نہ ہو جائے اس میں وہ وزن کبھی پیدا ہو ہی نہیں سکتا جو ایک داڑھی میں ہوتا ہے بھلے ہی وہ خشخشی کیوں نہ ہو۔ دنیا لاکھ ترقی کر جائے لیکن آج بھی معتبریت داڑھی والے مسلمان کو ہی حاصل ہے۔ ویسے اس بار میرا تجربہ اگر کامیاب رہا تو مستقل داڑھی رکھ لوں گا۔''

''اس کا مطلب کہ جب آپ داڑھی سے اس حد تک متاثر ہو چکے ہیں تو حمایت بھی اسی امیدوار کی کریں گے جس کے داڑھی ہوگی۔'' میں نے خان صاحب کو پھر کریدا۔'' آپ نے بالکل

صحیح فرمایا۔میں نے منن میاں کی حمایت کا فیصلہ کیا تھا لیکن جب یہ پتہ چلا کہ وہ اس لئے الیکشن میں نہیں کھڑے ہوئے ہیں کہ جیت کر پارلیمنٹ پہنچنا چاہتے ہیں بلکہ پچھلے دنوں گھر میں چوری ہو جانے سے انکا بہت پرانا شجرہ اور کھتونی چوری ہو گئے اسے حاصل کرنے کے لئے الیکشن لڑ رہے ہیں توان کی حمایت کا میں نے ارادہ بدل دیا اب کسی دوسرے امیدوار کی مدد کروں گا۔''

میں نے بڑی حیرت کے ساتھ خان صاحب سے پوچھا کہ ''الکشن میں کھڑے ہوکر کس طرح منن میاں اپنا شجرہ اور کھتونی تلاش کرلیں گے؟'' خاں صاحب نے ایک جہازی قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا'' آپ بالکل ہی معصوم ہیں۔ارے بھائی الکشن میں آج کل مخالفین کو زیر کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ اس کے ماضی کے حالات عوام کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔مثلاً امیدوار کے دادا پردادا حجام تھے یا قصائی تھے۔پولس کے مخبر تھے یا انگریزوں کے پٹھو تھے امیدوار کے پاس کتنی جائداد ہے اور کہاں کہاں ہے وغیرہ وغیرہ۔اب یہ ساری معلومات اگر منن میاں نگر پالیکا اور کچہری کے ذریعہ پھر سے معلوم کرنا چاہیں گے تو لاکھوں روپئے خرچ کرنا پڑیں گے اور اس میں وقت بھی بہت لگے گا۔الیکشن میں صرف ضمانت ضبط ہوگی باقی کا کام مخالفین خود کر کے دے دیں گے۔''

'بھائی آپ نے یہ بہت عمدہ نسخہ بتایا ہے۔اب اگر کسی کو اپنا شجرہ معلوم کرنا ہو تو نگر پالیکا کا رکارڈ دیکھنے کے بجائے الیکشن میں کھڑا ہو جائے اس کا کام اپنے آپ ہی ہو جائے گا۔۔۔''

ریزہ ریزہ چٹان

آج چوتھا دن بھی گزر گیا اور اس کا فون نہیں آیا۔ نہ جانے کتنے چکر یاسمین نے لاؤنج کے لگائے بہت دیر تک وہ فون کو گھورتی رہیں لیکن گھنٹی کا نہ بجنا تھا نہ بجی۔ ایک عجیب سی بے چینی اور جھنجھلاہٹ اس پر سوار تھی۔ وہ بار بار یہی سوچتی کہ جب پہلی بار اس نے فون کیا تھا اسی وقت فون نہ اٹھاتیں تو اچھا تھا۔ آج جس کیفیت سے وہ دوچار تھیں اس سے تو پیچھا چھوٹا ہوتا۔ لیکن پھر یہ خیال آتا کہ اس کے فون نے ہی تو اس کی دنیا بدل دی تھی۔ کتنے حسین جذبوں سے اسکو روشناس کرایا تھا۔ اب تک کیسی پھیکی اور سادی زندگی گزر رہی تھی۔ وہ سمجھتی تھیں کہ یہی زندگی کی معراج ہے لیکن اب زندگی کا ایک ایک لمحہ حسین اور خوشگوار لگنے لگا تب اسے یہ احساس ہوا کہ اصلی زندگی تو یہ ہے۔ مگر ان ساری باتوں کے باوجود انہیں اس وقت اس پر بے انتہا غصہ آرہا تھا۔ اچھی خاصی پرسکون زندگی میں تلاتم پیدا کر کے خود نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔

کچھ دن پہلے وہ دھوپ میں بیٹھی ہوئی سویٹر بن رہی تھیں جب فون کی گھنٹی بجی تھی۔ گھر میں سوائے نوکرانی کے اور کوئی نہیں تھا۔ امی اپنے کالج جا چکی تھیں۔ چھوٹے بھائی بہن بھی اسکول میں تھے۔ خود یاسمین کے کالج میں اسٹرائک چل رہی تھی اسلئے راوی چین لکھتا تھا۔ لان سے اٹھ کر لاؤنج میں جانا انہیں کھل رہا تھا لیکن جب بہت دیر کے بعد بھی فون خاموش نہیں ہوا تو انہیں اٹھنا ہی پڑا۔

ان کے ہیلو کے جواب میں بڑے شائستہ انداز میں پوچھا گیا۔

''کیا آپ آشیانہ سے بول رہی ہیں''۔ 'جی ہاں۔'یاسمین نے بھی بڑے تمیز سے جواب دیا۔

'آپ کا فون نمبر ۶۴۸۲۷۱ ہے نہ۔' 'جی ہاں یہی ہے۔'

'سعید خاں صاحب یہیں رہتے ہیں نہ۔'

لہجہ اب بھی بڑا مہذب تھا لیکن ایک ہی قسم کے سوالوں سے یاسمین کا جھنجھلا جانا فطری تھا۔

''جی ہاں یہیں رہتے ہیں' ''آپ بتائیں آپ چاہتے کسے ہیں''۔

''آپ کو'' بڑے پیارے انداز میں کہا گیا۔

اس جواب نے یاسمین کا دماغ بھک سے اڑا دیا۔ 'یہ کیا بدتمیزی ہے۔'

''کسی کو چاہنا اگر بدتمیزی ہے تو اپنے پاپا سے کہہ دیجئے کہ آپ کی ممی کو چاہنا چھوڑ دیں۔''

''فضول باتیں نہ کریں اور یہ بتائیں کہ آپ کو ملنا کس سے ہے۔''

'آپ سے! اور ہاں اس میں فضول بات کون سی ہے آپ نے پوچھا میں کسے چاہتا ہوں تو میں کیسے جھوٹ بول دیتا کہ میں کسی اور کو چاہتا ہوں۔

اب یاسمین کے سمجھ میں آ گیا کہ اتنی دیر سے وہ بے وقوف بن رہی تھی۔ یہ کوئی لفنگا تھا جو ان سے بات کر رہا تھا۔ انہوں نے فوراً ریسیور نیچے رکھ دیا۔

تھوڑی دیر تک ان کے ذہن میں اس اجنبی کی فضول باتیں گردش کرتی رہیں اس کے بعد وہ گھر کے کام کاج میں مصروف ہو کر بھول گئیں۔ اکثر اس طرح کے رانگ نمبر مل جانے پر بے تکی باتیں ہو جایا کرتی تھیں اس لئے انہوں نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔

دوسرے دن ٹھیک گیارہ بجے پھر فون کی گھنٹی بجی۔ یاسمین لاؤنج میں ہی تھیں پھر بڑھ کر فون اٹھالیا۔ انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا آج بھی وہی شخص ہوگا۔

"کل کا غصہ اگر اتر گیا ہو تو تھوڑی دیر بات کر لیجئے۔" پرسکون انداز میں کہا گیا۔ یاسمین کا دل تو چاہا کہ بغیر کچھ بولے فون بند کر دیں لیکن یہ سوچ کر کہ لہجے سے اچھے خاندان کا لگتا ہے اسے شرافت کا واسطہ دے کر سمجھائیں شاید سمجھ جائے۔

"دیکھو مسٹر تم چاہے جو کوئی بھی ہو بات چیت سے کسی اچھے خاندان کے لگتے ہو اور ایک اچھے خاندان کے لڑکے پر یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ فون پر شریف لڑکیوں کو تنگ کرتا پھرے۔"

"مجھے خاندانی لڑکا تسلیم کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ ویسے مجھے آپ کی اس صفت کا علم نہیں تھا کہ آپ بات چیت سے ہی خاندان تک کا اندازہ لگالیتی ہیں۔" شوخی بھرا جواب حاضر تھا۔

"تمہارے پاس اور کوئی کام نہیں ہے جو فون پر وقت برباد کرتے ہو۔ اب یاسمین کو غصہ آرہا تھا۔

"آپ اسے وقت کی بربادی کہتی ہیں۔" میرے لئے تو سب سے حسین لمحے وہی ہوتے ہیں جو آپ سے گفتگو میں گزرتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ یاسمین اس کی اس بے باک بات پر کچھ کہتی "ویسے اتنی دیر بات کرنے کا شکریہ" کہہ کر اس نے فون بند دیا۔

آج صبح سے ہی یاسمین نے سوچ رکھا تھا کہ اگر اس کا فون آیا تو بہت کس کے ڈانٹوں گی۔ اس کی کل کی شرارت پر انہیں بہت تیز غصہ چڑھا تھا۔ کیسے باتوں میں الجھا کر اپنی بات کہہ گیا تھا۔ اور جب تک وہ کچھ تلخ جواب دیں تو فون بند کر دیا۔

جیسے ہی فون کی گھنٹی بجی وہ شروع ہو گئیں۔ ''تم انتہائی کمینے اور ذلیل آدمی ہو۔ کاش تمہارا پتہ ٹھکانا معلوم ہوتا تو تمہیں کھڑے کھڑے جیل بھجوادیتی۔''

''چھی چھی اچھی لڑکیوں کے منہ سے اسطرح کی باتیں زیب نہیں دیتیں۔ یوں بھی جب خوبصورت لڑکیاں گالی دیتی ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے شیشے کی صراحی سے گندہ پانی نکل رہا ہو۔''

چکنا گھڑا ہے کمبخت اتنا سننے کے بعد بھی کیسے مزے سے بات کر رہا ہے۔ یہ سوچتے ہوئے پھر یاسمین نے کہا ''تو تم نہیں مانو گے''۔

''میں روٹھا ہی کب تھا جو مان جاؤں، ماننا تو آپ کو ہے۔''

ہر بات میں اپنے مطلب اور معنی نکال لیتا ہے۔ دل میں اس کی ذہانت کی قائل ہوتے ہوئے یاسمین نے غیرت دلائی۔

''اگر تمہاری بہن سے کوئی فون پر اس طرح کی باتیں کرے تو تمہیں کیسا لگے گا۔''

''اگر تنگ کرنے والا ہماری طرح ہو تو بہن کی خوش قسمتی پر فخر کریں گے اور ساتھ میں اسے تنبیہ بھی کریں گے کہ لوگوں سے تمیز سے بات کیا کرے۔'' جواب جیسے زبان پر رکھا ہوا تھا۔

''بڑا ناز ہے اپنے آپ پر'' پتہ نہیں کیسے وہ بے تکلف ہوتی جا رہی تھی۔

''چھوڑیئے یہ باتیں بتائے آپ کے کالج کی اسٹرائک کب ختم ہو رہی ہے۔''

''کیوں آپ کو اسٹرائک سے کیا مطلب'' وہ تم سے آپ پر آ گئیں۔

''میں نے اس لئے پوچھا کہ اکیلے آپ گھر میں بور ہوتی ہوں گی۔ ممی تو آپکی دو بجے تک آتی ہوں گی۔''

’’آپ ہمارے گھر کی جاسوسی کرتے ہیں۔‘‘یاسمین کو پھر غصہ آ گیا۔

’’آپ سے بات کرنے کے لئے اتنی معلومات تو رکھنی ہی پڑتی ہے۔ہمیں آپ کی عزت کا خیال بھی تو کرنا ہے۔‘‘محبت سے لبریز لہجے میں کہا گیا‘

یاسمین یہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ اس کی باتوں کے سحر میں ڈوبتی جا رہی ہے۔اس کی دلچسپ باتیں انہیں اچھی لگنے لگی تھیں۔انہیں اس بات کا خیال بھی نہیں رہا کہ اتنی دیر بات کر کے وہ اس کی حوصلہ افزائی کر رہی ہیں۔

ان کی خاموشی کے جواب میں پھر پوچھا گیا’کہاں کھو گئیں۔‘

اپنے کمزور پڑتے ہوئے اصولوں اور ڈگمگاتے ہوئے خیالات کو انہوں نے پھر سے قابو میں کیا اور اس کی بے تکلفی کے جواب میں بڑی برہمی سے کہا بس بہت ہو چکا اب آئندہ آپ فون نہیں کریں گے۔فون بند کرتے کرتے نہ جانے ان کے منہ سے کیسے خدا حافظ نکل گیا۔اپنی اس غلطی کا احساس انہیں ضرور ہوا لیکن یہ سوچ کر کہ اب وہ فون نہیں کرے گا وہ مطمئن ہو گئیں۔

دوسرے دن سوا دس بجے فون کی گھنٹی بجی تو بے خیالی میں انہوں نے فون اٹھا لیا۔فون بند نہیں کریں گی آپ بڑے اعتماد کے ساتھ کہا گیا۔یاسمین کو اس کے اس یقین پر کہ فون پر وہی ہیں حیرت ہوئی اور وقت سے پہلے فون کرنے کی حرکت پر محظوظ بھی ہوئیں۔ان کی خاموشی کے جواب میں پھر کہا گیا’’مجھے معلوم تھا کہ گیارہ بجے آپ فون نہیں اٹھائیں گی اس لئے آج پہلے ہی کرنا پڑا۔‘‘ جو کچھ کہنا ہے جلدی سے کہہ کر ختم کیجئے۔یاسمین نے لہجے کو سخت رکھنے کی پوری کوشش کی۔

’’صرف اتنا کہ انسان کو کبھی کبھی دل کا کہنا مان لینا چاہئے۔آپ بھی دل پر سے دماغ کے پہرے کو ہٹا دیجئے۔پھر دنیا آپ کو بہت حسین نظر آئے گی۔‘‘

’’آپ کو جب ہمارے گھر کی ہر بات کی خبر ہے تو میری طبیعت کے بارے میں ضرور معلوم ہوگا۔ دل جذبات دھڑکن یہ سارے الفاظ میرے لئے بے معنی ہیں۔ میں دوسروں سے ذرا مختلف ہوں۔ ان باتوں میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔‘‘

’’آپ نے اپنے آپ میں ہی اتنی دلچسپی لے رکھی ہے کہ باقی چیزوں میں دلچسپی لینے کے لئے کچھ بچا ہی نہیں ہے۔ ویسے اتنی خود پسندی اچھی بات نہیں ہے۔‘‘

’’یہ نصیحتیں آپ بائی پوسٹ بھی بھیج سکتے تھے فون پر وقت خراب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔‘‘ یاسمین کو سچ مچ غصہ آ گیا۔

’’انسان کو اپنے گرد اتنی اونچی دیواریں نہیں اٹھانی چاہئے جس سے اندر کی آہٹ باہر نہ جا سکے اور باہر کی دستک اندر نہ آ سکے۔‘‘ یاسمین کے غصے کا اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔

’’ویسے یاسمین یہ احساس کتنا حسین اور فرحت بخش ہوتا ہے کہ کوئی ہمیں چاہتا ہے۔ آپ کبھی اس طرح کے لمحوں سے دوچار ہوں تو انہیں محفوظ کر لیجئے گا۔ ایسے لمحے زندگی میں بار بار نہیں آتے۔‘‘

پہلی بار اس نے نام سے مخاطب کیا تھا۔

اس کی اس طرح کی باتوں سے پتہ نہیں کیوں وہ گھبرا رہی تھیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا کیا جواب دے۔ جب کوئی معقول جواب نہیں سوجھا تو وہ غصہ کرنے لگی۔

’’تم سے کل بھی میں نے کہا تھا کہ مجھے فون مت کیا کرو لیکن شریف آدمی ہوتے تب نہ بات سمجھ میں آتی۔ گھٹیا آدمی زبان کی بات کہاں سمجھتے ہیں۔‘‘ یہ کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا۔

دن بھر وہ اپنے آپ کو گھر کے کام میں الجھائے رہیں لیکن دماغ میں بار بار فون والے کی

باتیں آجاتیں۔ کتنی صاف ستھری باتیں کرتا ہے۔ اب تک ایک بھی چھچھوری بات نہیں کی۔ محبت کے انداز میں بھی کتنا محتاط ہے۔ نہ ہی کوئی گھٹیا ڈائیلاگ بولا نہ بے تکی باتیں کیں۔ صرف انداز گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ مجھ میں دلچسپی لے رہا ہے۔

ارے یہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔ وہ چونک جاتیں۔ فون پر تو کتنی نفرت کا اظہار کیا تھا اور اب ایک بات بھی اس کے خلاف نہیں جا رہی ہے۔ صرف اچھے پہلو ہی ذہن میں آرہے ہیں۔ اس قسم کی سوچوں سے وہ خود ہی گھبرا گئیں۔

شام کو وہ اپنی دوست سے ملنے چلی گئیں۔ وہاں سے لوٹ کر آئیں تو ممی کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتی رہیں۔ اسکے خیال سے اپنے آپ کو دور رکھنے کا یہی طریقہ سمجھ میں آیا تھا۔

سب کے صبح چلے جانے کے بعد جب وہ خود پڑھنے بیٹھیں تو پھر سے کل والی باتیں یاد آنے لگیں۔ فون والی خوبصورت آواز نپے تلے صاف ستھرے جملے اس کے کان میں گونجنے لگے۔ وہ اس کی یاد سے جتنا پیچھا چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی اتنا ہی وہ یاد آرہا تھا۔ پہلی بار کسی نئے جذبے سے روشناس ہوئی تھی۔ اس لئے اس کی شدت کو برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ انہیں خود بھی حیرت تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ خود بڑے مضبوط ارادوں کی مالک تھیں۔ لیکن ایک اجنبی کے فون نے انہیں کتنا کمزور کر دیا تھا۔

کالج میں نہ جانے کتنے ان کی طرف بڑھے لیکن انہوں نے کسی کی حوصلہ افزائی نہیں کی اور نہ دوسروں میں اتنی ہمت ہوئی کہ وہ ان کے گرد کھڑی دیوار کو پھلانگ سکتے۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ بہت خشک مزاج اور چڑچڑی تھیں جس کے ڈر سے لوگ ان سے بے تکلف نہیں ہو پاتے تھے۔ وہ تو بڑی زندہ دل اور محفل پسند تھیں۔ ان کے بغیر ہر محفل سونی سمجھی جاتی تھی۔ سہیلیاں جب تک یاسمین کو

اپنا راز نہ بتا لیتیں انہیں چین نہیں ملتا تھا۔ مگر ان ساری باتوں کے باوجود ان کا ایک بھرم بنا ہوا تھا جسے توڑنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ شروع شروع میں بہت سے نوجوانوں نے ان کے لئے آہیں بھریں لیکن جب کشتی کنارے پر لگتی نہیں دکھائی دی تو سب نے اپنے راستے بدل لئے۔ اب تو پورے کالج میں وہ 'ہارٹ لیس' کے نام سے مشہور ہو گئی تھیں۔

یہ بات نہیں تھی کہ انہیں مردوں سے نفرت تھی یا اب تک انہیں کوئی اچھا ہی نہیں لگا تھا۔ بہت سے ایسے تھے جن سے وہ خود بھی متاثر تھیں۔ ان کے انداز انہیں اچھے لگتے تھے ان ہی میں ایک عامر بھی تھے۔

عامر یاسمین کے فرسٹ کزن تھے۔ آج کل انہیں کے شہر میں پوسٹیڈ تھے۔ عامر کی پر کشش شخصیت کا چرچہ سارے خاندان میں تھا۔ لمبے چوڑے خوبصورت ہنس مکھ عامر زیادہ طرح لڑکیوں کے آئیڈیل تھے۔ جب خاندان کی کسی تقریب میں پہنچ جاتے تو ہر طرف عامر کی ہی پکار رہتی۔ زیادہ تر لڑکیاں عامر کے گرد چکر کاٹا کرتیں۔

آشیانہ میں بھی وہ ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے۔ ممی سے لے کر چھوٹے بھائی بہن تک عامر کے گرویدہ تھے۔ شام کو جب عامر آ جاتے تو گھر کا ہر فرد ان کے گرد اکٹھا ہو جاتا۔ ان کی دلچسپ باتوں سے سبھی محظوظ ہوتے تھے۔ یاسمین بھی اکثر ان کی محفل میں شریک ہوتیں لیکن عامر سے کبھی وہ بے تکلف نہیں ہوتیں جب کہ ان کی موجودگی میں عامر کے رویے میں جو تبدیلی ہوتی وہ یاسمین سے چھپی نہیں تھی۔ اپنے لئے عامر کی آنکھوں میں بڑے خوبصورت جذبے بھی انہوں نے دیکھے تھے۔ لیکن کبھی عامر کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ ان کی آنکھوں کی تحریر پڑھ لیتی ہیں۔

یاسمین کا یہ محتاط انداز اس لئے نہیں تھا کہ عامر انہیں ناپسند تھے یا ان کی باتیں انہیں بری لگتی

تھیں۔ وہ بھی عامر کی شخصیت سے متاثر تھیں۔ ان کا رکھ رکھاؤ انہیں پسند بھی تھا۔ لیکن عشق و محبت کی باتوں سے انہیں الجھن ہوتی تھی۔ پتہ نہیں کیوں یہ باتیں انہیں سطحی لگتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کسی کے بھی جذبوں کی پزیرائی نہ کر پاتیں۔

مگر تین چار دن سے اس فون والے اجنبی نے ان کے سوچنے کا رخ ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔ جن باتوں کو ہلکی اور سطحی سمجھتی چلی آرہی تھیں وہ اب ایک ٹھوس حقیقت بن کر ان کے سامنے کھڑی تھی۔ جذبوں کی شدت اور خوبصورتی کا احساس انہیں ہونے لگا تھا۔ دل نے بھی ایک نئے انداز سے دھڑکنا شروع کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بے انتہا پریشان ہونے کے باوجود ان کا دل اندر سے بہت خوش تھا اس پریشانی میں بھی انہیں ایک سرور مل رہا تھا۔

جب سوچنے کا انداز اور خیالات بدل گئے تو پھر پوری شخصیت ایک نئے روپ میں سامنے آگئی۔ اب نہ تو کہیں خود پسندی کا کوئی جذبہ باقی تھا اور نہ ہی بھرم ٹوٹنے کا دکھ تھا۔

چاہنے اور چاہے جانے کی فطری تمنا سارے احساسات پر غالب آچکی تھی۔ ابھی تک اپنے بھٹکتے ہوئے جذبات وہ جس سے چھپا رہی تھیں اب اسے ہی سب سے پہلے بتانے کی بے چینی تھی۔ لیکن آج وقت بھی نہ جانے کیوں چیونٹی کی رفتار سے گزر رہا تھا۔ بار بار نگاہیں گھڑی کی جانب اٹھ جاتیں لیکن ہر بار انہیں سوئی کہیں پر اٹکی ہوئی ملتی۔ انہیں گیارہ بجنے کا بڑی بے چینی سے انتظار تھا۔ کیونکہ گیارہ بجے ہی اس کا فون آتا تھا۔

اچانک ان کے دماغ میں ایک تکلیف دہ شبہ نے سر ابھارا۔ اگر اس نے فون نہ کیا تو کیا ہوگا۔ کل وہ اس کو اتنا ڈانٹ چکی تھیں کہ آج فون آنے کی امید کم ہی تھی۔ اتنی ڈانٹ ڈپٹ پر تو بڑے بڑے لفنگے پیچھا چھوڑ دیتے ہیں وہ تو کافی خوددار اور غیرت مند لگتا تھا۔

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا انہیں یقین ہوتا جا رہا تھا کہ اس کا فون نہیں آئے گا اور اسی یقین نے ان کی پریشانی کو اور بڑھا دیا۔ ان کے پاس اس کا فون نمبر پتہ ٹھکانہ کچھ بھی تو نہیں تھا۔ یہاں تک کہ وہ اس کا نام تک نہیں جانتی تھیں۔ ابھی تک کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔

یاسمین کی پریشانی عروج پر تھی۔ نہ کسی کام میں دل لگ رہا تھا نہ ہی کہیں جانے کا موڈ ہو رہا تھا۔ بس دل یہی چاہ رہا تھا کہ اس کا فون آ جائے اور وہ اس سے اپنی کیفیت بتا کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیں۔ جذبہ صادق ہو تو اللہ میاں بھی مدد کرتے ہیں۔

گھنٹی بجی تو انہوں نے فوراً فون اٹھا لیا۔ بہت دیر سے وہ فون کے پاس ہی بیٹھی تھیں۔

''صبح بخیر'' ادھر سے مختصر سی شروعات ہوئی۔

یاسمین کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح سے بات شروع کریں۔

شوخی سے بھرپور لہجے میں کہا گیا'' آپ شرمندہ نہ ہوں میں نے کل کی باتوں کا برا نہیں مانا۔

آپ کی آدم بیزاری ہی تو پسند آئی ہے ورنہ خوبصورتی تو آج کل ماری ماری پھرتی ہے۔

بہت دیر سے ضبط کر رہی تھیں لیکن اب ضبط کی انتہا ہو چلی تھی۔ یاسمین کسی معصوم بچے کی طرح پھوٹ پڑیں۔

''کس جنجال میں پھنسا دیا تم نے۔ سارا سکون غارت ہو کر رہ گیا ہے۔ اچھی بھلی زندگی گزار رہی تھی پتہ نہیں کہاں سے تم ٹپک پڑے۔ کسی کام میں بھی میرا دل نہیں لگ رہا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟''

اتنی لمبی تقریر کے جواب میں صرف اتنا کہا گیا "جو میں کر رہا ہوں"۔ پھر یہ کہہ کر کہ "دنیا کی سب سے اچھی عبادت یہی ہے کہ کسی سے محبت کی جائے" اس نے فون بند کر دیا۔

دل نے محبت کرنا کیا سیکھ لیا کہ ساری دنیا ہی حسین نظر آنے لگی۔ حالانکہ اس سے ابھی تک ملاقات نہیں ہوئی تھی صرف فون پر ہی باتیں ہوتیں مگر یہ دس منٹ کی بات چیت ہی دن بھر ان کا موڈ خوشگوار رکھنے کے لئے کافی تھی۔

جب دل خوش رہتا ہے تو سبھی کچھ اچھا اچھا لگتا ہے۔ اب وہ گھر کے کام کاج میں نمایا ں حصہ لیتیں اور ہر آنے جانے والے سے بھی بڑی خوش مزاجی سے ملتیں۔ عامر آتے تو وہ ان کے پاس بڑی دیر تک بیٹھ کر باتیں کیا کرتیں۔ اس تبدیلی کو محسوس کر کے عامر نے ایک بار کہا بھی "کیا بات ہے یاسمین آج کل آپ کچھ سُدھرتی ہوئی نظر آ رہی ہیں۔"

"میں بگڑی ہی کب تھی۔" بڑے شوخ انداز سے وہ جواب دیتیں۔

"اس انداز سے تو کبھی نہیں ملیں" عامر کے اتنا کہنے پر بڑی خوبصورت مسکراہٹ ان کے چہرے پر آتی اور وہ خاموش ہو جاتیں۔

اپنی اس تبدیلی کی وجہ وہ کیسے عامر کو بتا سکتی تھیں۔

مگر ان چار دنوں میں وہ ہنسنا بولنا سب کچھ بھول چکی تھیں۔ نہ تو اس کا کوئی فون آیا تھا اور نہ ہی کسی ذریعہ سے اس کی کوئی خبر ملی تھی۔ پتہ نہیں کس حال میں تھا۔ خود یاسمین کے پاس اس سے رابطہ قائم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ کئی ملاقاتوں کے بعد بھی وہ اس کا پتہ ٹھکانا معلوم نہیں کر سکی تھیں۔ وہ باتوں میں اس حد تک الجھائے رکھتا تھا کہ فون نمبر تک پوچھنے کا خیال نہیں آتا تھا اور جب کبھی یاسمین اس موضوع پر بات کرتیں تو جلدی سے فون بند کر دیتا۔ انہیں اب یہی فکر تھی کہ کب تک

اس کے انتظار میں وہ اس طرح پریشان رہیں گی۔ یاسمین کے گھر کا ماحول بھی آج کل بہت بور چل رہا تھا۔ ممی کی طبیعت خراب تھی۔ چھوٹے بھائی بہن کے امتحانات چل رہے تھے۔ اس لئے گھر میں ہنگامے بھی کم تھے۔ آج کل عامر بھی نہیں آرہے تھے کہ ان ہی کے پاس بیٹھ کر کچھ دل بہل جاتا۔ صبح سے شام تک بے چینی سے وہ پورے گھر میں پھرا کرتیں۔

یاسمین کے کالج کی اسٹرائیک ختم ہو چکی تھی۔ وہ کالج جانے کے لئے تیار ہو رہی تھیں کہ فون کی گھنٹی بجی بے دلی سے انہوں نے فون اٹھالیا۔

''یہ چار دن کیسے گزرے'' بڑی اپنائیت سے پوچھا گیا۔

بہت سی باتیں وقت خود بخود سکھا دیتا ہے۔ یاسمین روٹھی ہوئی تھیں جواب کیسے دیتیں۔

''خفگی سے پہلے یہ سوچنا چاہئے کہ دوری کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ ہم بیمار ہو گئے تھے۔''

''کیسے۔ کیا ہوا تھا۔'' یاسمین یہ بھول گئیں کہ وہ روٹھی ہیں۔

''بس ایسے ہی کچھ بخار وغیرہ آگیا تھا۔''

''اب ٹھیک ہیں؟ ہمیں یاد کیا تھا؟'' یاسمین نے دھیرے سے پوچھا۔

''یاد اسے کیا جاتا ہے جسے بھلایا جا سکے، جو ہر وقت دل و دماغ میں بسا ہوا سے یاد کرنے کی کیا ضرورت ہے۔'' بڑا خوبصورت جواب تھا۔

''کیا ہمیشہ آپ ایک اجنبی ہی کی طرح ملتے رہیں گے؟ ہمیں آپ کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم۔'' یاسمین نے شکوہ کیا۔

''کیا جاننا چاہتی ہیں؟''

''ہمیں معلوم ہی کیا ہے۔ آپ کا نام پتہ ٹھکانا کچھ بھی تو نہیں جانتے۔ لیکن اب ہم آپ کو

دیکھنا چاہتے ہیں۔''

''اگر ہمیں دیکھ کر آپ کو مایوسی ہوئی تو کیا کیجئے گا۔'' بڑا ہی معقول سوال پوچھا گیا۔

''مایوسی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کیوں کہ انسان کی پہچان اس کی شکل دیکھ کر نہیں بلکہ اس کے خیالات جان کر ہوتی ہے۔ اور اتنے دن میں ہم آپ کو پوری طرح سمجھ چکے ہیں۔'' یاسمین کے جواب نے اسے مطمئن کر دیا۔

''اچھا تو کل شام چار بجے نیشنل پارک میں نہرو جی کے مجسمہ کے پاس مل جایئے۔ میں نیلی شرٹ اور سفید پینٹ میں رہوں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

بہت سے لوگ دیکھنے میں بدصورت ہوتے ہیں لیکن ان کی آواز اور بات کرنے کا انداز بہت پیارا ہوتا ہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جنہیں اللہ نے آواز اور شکل دونوں خوبصورت دے رکھی ہیں۔ اب پتہ نہیں وہ کیسا ہوگا یاسمین نے سوچا۔ اگر واقعی خراب ہوا تو کیا یاسمین کے حسین تصورات کے محل چکنا چور نہیں ہو جائیں گے یہی سب کچھ سوچتی ہوئی وہ نیشنل پارک پہنچ گئیں۔ نہرو جی کے مجسمہ کی قریب نیلی شرٹ اور سفید پینٹ پہنے ایک لمبا آدمی کھڑا تھا جو پیچھے سے یقیناً بہت اچھا لگ رہا تھا۔

یاسمین نے اپنی دھڑکنوں کو قابو کر کے اسے مخاطب کیا۔ ''آداب۔''

''جیتی رہئے'' کے جواب کے ساتھ وہ گھوم گیا۔

''عامر بھائی آپ'' حیرت میں ڈوبی ہوئی یاسمین کی آواز ابھری۔

''ہاں میں تمہارا فون والا اجنبی۔'' یاسمین کی حیرت سے عامر محظوظ ہو رہے تھے۔

عامر کو دیکھ کر وہ کچھ عجیب سی کیفیت سے دو چار تھیں۔ ''یہ کیا مذاق ہے۔''

''یہ مذاق نہیں حقیقت ہے یاسمین۔'' عامر نے کہنا شروع کیا۔ ''بہت دنوں سے دل کی ہر دھڑکن پر صرف تمہارا ہی نام لکھا ہے لیکن محبت کے اوچھے انداز مجھے پسند نہیں ہیں اس لئے میں نے یہ طریقہ نکالا۔ صبح کو آفس سے میں تمہیں فون کرتا اور شام کو گھر پر آ کر تمہارے دل کی کیفیت سے لطف اندوز ہوتا۔''

اس بیچ یاسمین یہ سوچ رہی تھی کہ کیا عجیب اتفاق ہے فون والی آواز کے خاکے میں جب بھی وہ رنگ بھرتیں تو اس میں عامر کا ہی چہرہ ابھرتا تھا۔ اور وہ ہمیشہ یہی سوچتیں کہ کاش فون والا عامر کی طرح کا ہو۔ اس وقت خود عامر سامنے کھڑے تھے اس لئے خوشی ان کی برداشت سے باہر ہو رہی تھی۔ مگر عامر کی شرارت کا جواب بھی دینا تھا اس لئے بڑی سنجیدگی سے یاسمین نے کہا'' آپ کا یہ انداز ہمیں پسند نہیں آیا۔ آپ کو دیکھ کر بہت شاک لگا ہے۔''

یاسمین کی سنجیدگی دیکھ کر عامر کی ساری شوخی ہوا ہوگئی۔ ''ضروری نہیں ہے کہ ہر راہی کو اس کی منزل ملے۔ تم پیچھے لوٹنا چاہتی ہو تو لوٹ سکتی ہو۔'' عامر کی آواز بھرا گئی تھی۔ وہ چپ چاپ جانے لگے۔

''چچ۔۔۔ چچ مردوں کے منہ پہ اداسی اچھی نہیں لگتی۔'' یاسمین کی آواز کی شوخی عامر سے چھپی نہ رہ سکی۔ وہ پلٹے تو یاسمین کے چہرے پر حسین مسکراہٹ دیکھ کر ان کی اداسی پل بھر میں غائب ہوگئی۔ وہ سمجھ گئے کہ یاسمین نے ان کی شرارت کا بدلہ اس طرح لیا ہے۔ اب دونوں ہی کے چہرے پر سارے جہان کی خوشیاں رقص کر رہی تھیں۔۔۔

محبت کی پہلی قسط

بیگم رحمان سے جب سائرہ نے کہا ''مما میں ایک پریشانی میں پڑ گئی ہوں'' تو انہوں نے ٹی وی سے نظریں ہٹائے بغیر کہا 'کیا کسی بڑی رقم کی ضرورت پڑ گئی ہے۔'' 'نہیں مما پیسے تو میرے پاس ہیں۔'' تو اس بار بھی مارکس خراب آئے ہونگے اور کلاس پرموشن میں دقت آرہی ہوگی۔' بیگم رحمان کی نگاہیں اب بھی ٹی وی سیریل پر تھیں۔ 'نہیں مما ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ دھیان دیں تو میں بتاؤں بھی۔' بیگم رحمان نے ٹی وی آف کیا اور بیٹی کی طرف گھوم گئیں۔ 'ہاں! اب بتائے میری بیٹی کہ ایسی کون سی مصیبت آن پڑی ہے جو مما کی یاد آگئی۔'

'مما دراصل...' سائرہ کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ اور پھر اس نے جلدی سے جملہ پورا کر دیا۔ 'میں پریگنینٹ ہوگئی ہوں۔' بیگم رحمان کا ہنستا ہوا چہرہ ایکدم سے بجھ گیا۔ 'تم سے کتنی بار کہا تھا کہ احتیاط برتا کرو لیکن تم نری بیوقوف کی بیوقوف رہیں۔' بیگم رحمان کو اس بات کا صدمہ قطعی نہ تھا کہ ان کی کنواری بیٹی پریگنینٹ ہے۔ انہیں تو اس بات پر غصہ آرہا تھا کہ اس نے احتیاط کیوں نہیں برتی۔

'مما میں ہر بار بہت احتیاط برتتی تھی۔ اس بار ہلز پر پکنک منانے گئے تھے وہیں چوک ہو گئی۔'' کتنے دن کا ہے۔' بیگم رحمان نے اس انداز میں پوچھا جیسے امتحان کی تاریخ دریافت کر رہی ہوں۔ 'چوتھا مہینہ ہے' سائرہ نے سر جھکا کر کہا۔' اور تم ابھی تک سو رہی تھیں۔' بیگم رحمان کو پھر غصہ آگیا۔' دراصل قیصر نواب نے کہا تھا کہ ہم لوگ شادی کر لیں گے اور اس بچے کو پالیں گے لیکن مما

غزالہ ہے نا وہ بڑی کُتیا ہے۔ قیصر نواب پر ہمیشہ بھیرایا کرتی تھی۔ اب وہ اسی کمینی کے چکر میں پڑ کر مجھ سے دور ہو گئے۔'

رحمان صاحب شہر کے معزز ترین عرب پتی تھے۔ کپڑے کی کئی ملوں کے مالک تھیں۔ سیاست میں بھی خاصی دلچسپی رکھتے تھے۔ صبح سے شام تک کاروباری میٹنگز اور سیاسی جلسوں میں مصروف رہتے تھے۔ بیگم رحمان کی اپنی خود کی کٹی پارٹیز اور لیڈیز کلب کی مصروفیات تھیں۔ اکلوتی بیٹی سائرہ کے پاس ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت کے علاوہ دنیا کی ہر چیز موجود تھی۔ دوست احباب تفریحات ڈانس پارٹیز یہی سب اس کی دلچسپیاں تھیں۔

ہائی سوسائٹی میں کردار کے علاوہ سب چیز پر دھیان دیا جاتا ہے۔ سائرہ نے بھی دولت کی طرح اپنے حسن اور جوانی کو بڑی فراخ دلی سے لٹایا تھا۔ لیکن ایک مسلم گھرانے کی پروردہ ہونے کے ناطے ابھی اتنی غیرت باقی تھی کہ بن بیاہی ماں کی حیثیت سے کسی بچے کو پالنے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔

'تم نے تو بڑی مصیبت میں پھنسا دیا بیٹا۔' 'اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ کسی گدھے کو پکڑ کر تمہاری شادی کرادی جائے۔ اپنے برابر والا تو کوئی قبول کرے گا نہیں اب کوئی شریف زادہ ہی تلاش کرنا پڑے گا۔' بیگم رحمان تشویش میں مبتلا ہو گئیں۔

ایک ماہ کے اندر بیگم رحمان نے رحمان صاحب کے بھتیجے سلطان میاں سے سائرہ کی شادی کرادی۔ سلطان کوآپریٹیو بینک میں مینیجر تھے۔ نوجوان خوبصورت خودار سلطان کے گھر جب بیگم رحمان سائرہ کے رشتے کی بات کرنے گئیں تو سلطان کی ماں عابدہ بی کو بڑی حیرت ہوئی۔ کیوں کی بیگم رحمان پانچ سال پہلے سلطان کے باپ کے انتقال کے موقع پر آئی تھیں اس کے

بعد اب آئیں تو عابدہ بی سوچنے لگیں کہ آج تو سب خیریت ہے پھر یہ کیسے آگئیں۔ جب بیگم رحمان نے بغیر کسی تمہید کے سائرہ کے لئے سلطان کو مانگا تو انہیں اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ کہاں سائرہ ایک عرب پتی کی بیٹی کہاں سلطان ایک معمولی بینک مینیجر جس کے بینک کا سالانہ ٹرن اوور بھی رحمان صاحب کی دوملوں کے برابر نہیں تھا۔ سلطان کی ماں نے تھوک گھونٹتے ہوئے بڑی مشکل سے کہا 'بھابھی ذرا سلطان سے میں بات کرلوں۔'' عابدہ اس میں سلطان سے بات کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آخر وہ رحمان صاحب کا سگا بھتیجہ ہے کیا اس پر ان کا اتنا بھی حق نہیں کہ سائرہ کے لئے اسے مانگ سکیں،' بیگم رحمان نے دوٹوک الفاظ میں خود ہی رشتہ دیا اور خود ہی منظور کرلیا۔

چند روز بعد ایک عالی شان ہوٹل میں سائرہ کی شادی سلطان میاں سے ہوگئی۔ رحمان صاحب نے بچوں کے ہنی مون کے لئے سوئٹزرلینڈ کے ایک بہترین ہوٹل میں انتظامات کرادیئے تھے۔ دونوں شادی کے بعد سوئزرلینڈ چلے گئے۔ سائرہ کو بھی یہ نئی زندگی بہت پسند آئی۔

سوئٹزرلینڈ سے واپسی پر چند روز رحمان صاحب کی کوٹھی میں گزارنے کے بعد سلطان نے اپنی دلہن کو گھر لے جانے کی بات کہی تو سائرہ کے ساتھ بیگم رحمان کے ماتھے پر بھی بل پڑ گئے۔ 'تم کہاں رکھو گے سائرہ کو' بیگم رحمان نے بڑے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ 'وہیں جہاں میں اور میری امی رہتی ہیں۔' سلطان نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ 'بیٹے تمہارے گھر سے بڑے تو سائرہ کے باتھ روم ہیں وہ تمہارے گھر میں کیسے رہ سکے گی،' بیگم رحمان نے پھر ایک دلیل دی۔ سلطان کو اب یہ احساس ہونے لگا کہ یہ ساری کہانی گھر داماد بنانے کی ہے۔ 'یہ سب کچھ تو آپ کو شادی سے پہلے سوچنا چاہئے تھا۔' اس سے پہلے کہ سائرہ کوئی تلخ جواب دیتی بیگم رحمان کو یاد آ گیا کہ یہ شادی تو کسی مصلحت کی بنا پر ہوئی ہے اور اگر میاں بیوی کے درمیان ابھی سے تلخی شروع ہوگئی

تو پیٹ میں پلنے والے بچے کا کیا ہوگا۔انہوں نے اپنے موڈ کو خوشگوار بناتے ہوئے کہا کہ 'اچھا بیٹا لے جاؤ لیکن جلدی جلدی سائرہ کو لے کر آتے رہنا۔تم کو تو پتہ ہے کہ سائرہ کے بغیر ہم لوگ ایک پل بھی نہیں رہ سکتے'۔

سلطان اور ان کی ماں کی پرسکون زندگی کو جہنم بنانے سائرہ سلطان کے گھر آگئیں۔زمین و آسمان کا ملن نہ تو کبھی ہوا ہے اور نہ ہی کبھی ہوگا۔دو دن میں ہی حالات اتنے خراب ہوگئے کہ سائرہ اپنے گھر واپس آگئی۔میاں بیوی کی قربتیں نفرتوں میں بدل گئیں اور بات طلاق تک پہنچ گئی۔لیکن مسئلہ مہر کی رقم کا تھا جسے سلطان کئی جنم تک ادا نہیں کر سکتے تھے۔دس لاکھ روپئے مہر باندھا گیا تھا۔آخر ارب پتی کی بیٹی تھی اس کے جسم کو شرعاً چھونے کی قیمت دس لاکھ سے کم کیا ہوتی۔میاں بیوی کی اس لڑائی کو ایک دن ایک بے رحم ٹرک نے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ سلطان میاں شام کو بینک سے اپنی اسکوٹر پر واپس آرہے تھے نہ جانے کس سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے کہ سامنے سے آنے والے ٹرک کو نہ دیکھ سکے اور اس کی زد میں آگئے۔اور چند ہی لمحوں میں ایک بے جان لاش میں تبدیل ہوگئے۔

سائرہ بیگم اپنے پرانے دوستوں کے ساتھ ایک بڑے ہوٹل میں خوش گپیوں میں مشغول تھیں جس وقت ایک انشورینس کمپنی کے ایک ایجنٹ نے انہیں لفافے میں دس لاکھ روپئے کا چیک یہ کہتے ہوئے پیش کیا کہ میڈم ایسا بہت کم ہوتا ہے جب پہلی قسط جمع کرنے کے بعد ہی پارٹی حادثہ کا شکار ہو جائے۔سلطان صاحب نے اپنی پوری تنخواہ سے دس لاکھ کی پالیسی کی پہلی قسط بھری تھی اور آپ کو نامنی بناتے وقت یہ لفافہ بھی دیا تھا۔شائد وہ یہی سوچتے ہوئے جا رہے تھے کہ مہینے کے باقی دن کیسے گزاریں گے اور ٹرک سے ٹکرا گئے۔سائرہ نے پوری بات سننے کے بعد انشورینس کمپنی

کے ایجنٹ کا شکریہ ادا کیا اور ہوٹل سے باہر اپنی کار میں بیٹھ کر لفافہ کھولا۔ یہ سلطان کا پہلا اور آخری خط تھا۔ چند سطریں اس کے سامنے تھیں ''تم نے مجھے تحفہ میں چار ماہ کا بچہ دیا تھا میں تمہیں مہر کے دس لاکھ روپئے دے رہا ہوں۔ ''فقط تمہاری مجبوری سلطان۔'

سائرہ نے خط کو لفافے میں رکھا اور گاڑی گھر کی طرف گھمالی۔ وہ ہوٹل آئی تھی ارب پتی رحمان کی بیٹی بن کر اب گھر جا رہی تھی ایک خوددار بینک مینیجر کی بیوہ بن کر۔۔۔

کامیابی کا نیا سبق

مجھے جب یہ خبر ملی کہ آج سونو نے کالج کے لکچرر کو تھپڑ مار دیا ہے تو شرمندی اور دکھ کے بجائے نہ جانے کیوں ایک اطمینان کا احساس ہوا۔ تھوڑی دیر کے لئے بھی دل میں یہ خیال نہیں آیا کہ ہمارے گھرانے میں استاد کی عزت والدین سے زیادہ کرنا سکھایا جاتا ہے۔

رات میں جب کھانے کی میز پر سونو سے ملاقات ہوئی تو میں نے اس کے چہرے پر پریشانی کی ایک بھی لکیر یا ڈانٹ کھانے کا ذرا سا بھی خوف دور دور تک نہیں پایا۔ 'سونو بیٹے آج ہم نے ایک بری خبر سنی ہے۔'' کیا بات ہے پاپا سب خیریت تو ہے۔' سونو نے گھبرا کر پوچھا۔ 'میں نے کہا خیریت کہاں ہے تم نے اپنے ٹیچر کے ساتھ بدسلوکی کی ہے۔' میں نے سونو کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔ سونو نے جواب دیا کہ 'میں نے بدسلوکی کہاں کی ہے۔ صرف ایک تھپڑ ہی تو مارا ہے۔ پاپا وہ بہت ہی گھٹیا قسم کا آدمی ہے۔ پریکٹیکل میں اچھے نمبر دینے کے پیسے مانگتا ہے۔'

'میرا ایک دوست جو پڑھنے میں بہت تیز ہے مگر غریبی کے سبب پیسے نہ دے سکا لہٰذا اس ٹیچر نے اس کے نمبر کاٹ لئے۔ بس اسی بات پر مجھے غصہ آگیا اور میں نے بھی اس کے تھپڑ رسید کر دیا۔' سونو نے ٹیچر کو تھپڑ مارنے جیسے سنگین واقعہ کو کچھ اس انداز میں بیان کیا جیسے کسی بچے کو مٹی میں کھیلنے سے دور رکھنے کے لئے ایک ہلکی سی چپت لگا دی ہو۔ ایک آئی اے ایس آفیسر کے بیٹے سے سرکشی کی امید تو کی جا سکتی ہے لیکن بدتمیزی کی توقع کم ہوتی ہے۔

دوسرے دن جب پرنسپل اور ٹیچرس کا ایک گروپ میرے پاس سونو کی شکایت لے کر آیا تو میں نے اپنے بیٹے کی حرکت کی معذرت کرنے کے بجائے اس ٹیچر کے خلاف جانچ کرانے کی دھمکی

دے کر ان لوگوں کو خاموشی سے لوٹ جانے پر مجبور کر دیا۔ ٹیچرس کے چلے جانے کے بعد دل نے تھوڑی دیر تک تو ملامت کی کہ میں نے اچھا نہیں کیا لیکن فوراً ہی دماغ نے کمان سنبھال لی۔ میرے باپ دادا کے ساتھ جو کچھ بھی ہوتا رہا وہ ٹھیک تھا۔ یا میرے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اچھا ہو رہا ہے۔ میرا بیٹا مجھ سے زیادہ سمجھدار ہے وہ وقت کی نبض کو پہچانتا ہے زمانے کی رفتار پر اس کی گرفت ہے وہ ہم سب سے زیادہ کامیاب اور خوشگوار زندگی گزارے گا۔ دل و دماغ نے بیٹے کی پیروی کر کے میرے دل سے ٹیچر کے ساتھ کی گئی بدسلوکی کا بوجھ اتار دیا۔

میں نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے ڈیڈی کو ایک کامیاب ڈاکٹر پایا۔ چند دنوں کے بعد جب وہ ضلع کی سب سے بڑی کرسی پر سی ایم او بن کر بیٹھے تو میرے گھر والوں نے بہت خوشی منائی تھی۔ ہر ماں باپ کی پہلی تمنا یہی ہوتی ہے ان کا بیٹا ڈاکٹر بنے۔ میرے دادا دادی کی یہ تمنا میرے والد نے پوری کی تھی اور بڑی محنت اور ایمانداری سے سی ایم او کی کرسی تک پہنچے تھے۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوتی تھی کہ جب بھی شہر میں کوئی بیماری پھیلتی تو ڈی ایم صاحب ڈیڈی کو بلا کر اس طرح پھٹکارتے جیسے بیماری پھیلنے کے ذمہ دار صرف میرے ڈیڈی ہوں۔ ڈی ایم کی طرح میرے ڈیڈی بھی ضلع کے سب سے بڑے افسر تھے مگر ڈی ایم انہیں اپنا ایک ادنیٰ سا ملازم سمجھ کر ذلیل کیا کرتے تھے۔ ایک بار میرے سامنے بھی جب ڈی ایم صاحب ڈیڈی کے ساتھ بڑی بدتمیزی سے پیش آئے تو میں نے اسی وقت یہ طے کیا کہ میں اپنے ڈیڈی کی طرح ڈاکٹر نہیں بنوں گا بلکہ آئی اے ایس آفیسر بن کر پورے ضلع کا مالک بنوں گا۔ مجھے ڈاکٹر بن کر کسی ڈی ایم کی ڈانٹ نہیں کھانی ہے۔ گھر والوں کی خواہش کے خلاف میں نے پہلی ہی کوشش میں آئی ایس کا امتحان نہ صرف پاس کیا بلکہ صوبہ میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ چونکہ نمایاں کامیابی حاصل کی تھی اس لئے دو سال کے بعد ہی مجھے ایک شہر میں ضلع مجسٹریٹ کا چارج مل گیا۔

ایمانداری محنت اور لگن مجھے وراثت میں ملی تھی اس لئے پرائے شہر کو بھی اپنا شہر سمجھ کر ایک ماڈل شہر بنانے کی کوشش میں لگ گیا۔ لوگوں کے مسائل سننے میں سات ہی بجے گھر کے دفتر میں بیٹھ جاتا دس بجے تک سیکڑوں لوگوں کے دکھ درد سن کر دفتر کی راہ لیتا۔ میری محنت لگن اور ایمانداری نے مجھے شہر کا ہیرو بنا دیا۔ ہر طرف میرے چرچے ہونے لگے۔ لیکن شہر کے ایم ایل اے اور ایم پی مجھ سے ناراض ہو گئے۔ جب سبھی کام قاعدے قانون کی رو سے ہوگا تو ایم ایل اے اور ایم پی کے پاس کوئی کیوں جانے لگا اور ان کے پاس جب کوئی جائے گا نہیں تو ان کی آمدنی کے دروازے بھی بند ہو جائیں گے۔

شہر کے سارے لیڈر میرے پیچھے پڑ گئے۔ وزیر اعلیٰ کے پاس میرے خلاف درخواستیں جانے لگیں۔ فیکس بھیجے جانے لگے۔ اس کے باوجود میں اپنی جگہ پر ڈٹا رہا۔ یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ موجودہ وزیر اعلیٰ ہائی اسکول میں میرے ڈیڈی کے کلاس فیلو تھے۔ ہائی اسکول میں فیل ہونے کے بعد وہ سیاست میں چلے گئے اور میرے ڈیڈی آگے پڑھ کر ڈاکٹر بن گئے۔

وزیر اعلیٰ کا دورہ جب میرے شہر میں ہوا تو مجھے اطمینان تھا کہ میری کارکردگی اور ایمانداری سے وزیر اعلیٰ بہت خوش ہوں گے لیکن وہ تو مجھے ذلیل کرنے آئے تھے۔ شہر کے چھوٹے بڑے نیتاؤں نے جب میری جھوٹی شکایتوں کا دفتر کھولا تو انہوں نے ان شکایات کی تصدیق کرنا بھی گوارا نہیں کیا اور مجھے فوراً ضلع مجسٹریٹ کی کرسی سے ہٹا کر وزیر اعلیٰ کے سکریٹریٹ میں بلا لیا۔ اب آئی اے ایس ٹاپر ہائی اسکول فیل وزیر اعلیٰ کی فائلیں لئے ادھر سے ادھر گھومنے لگا۔ اس کے بعد سے میں نے کبھی کوشش نہیں کی کہ کسی شہر کا ضلع مجسٹریٹ بنایا جاؤں۔ چونکہ میں نے کبھی پیروی نہیں کی اس لئے میری تقرری غیر اہم عہدوں پر ہی ہوتی رہی۔ یہ سوچتا ہوا نوکری کے دن کاٹتا رہا کہ دن رات کی محنت کر کے آئی اے ایس بننے سے بہتر تھا کہ کسی اسکول میں ٹیچر ہو جاتا۔

چونکہ میں ہمیشہ خشک اور بے فیض عہدوں پر ہی رہا اس لئے ایک چھوٹا سا مکان اور ایک پرانی Fiat (فی ایٹ) کار کے علاوہ کچھ نہ حاصل کر سکا۔ آج جب سونوں کی شکایت کر کے اس کے ٹیچرس گئے تو مجھے اپنے بیٹے کا مستقبل بڑا روشن نظر آیا۔ میں تصور میں اپنے بیٹے کو اسی کرسی پر بیٹھے ہوئے دیکھنے لگا جس پر ہائی اسکول فیل وزیر اعلیٰ بیٹھے تھے۔ جو آج سیاست سے سنیاس لینے کے بعد بھی ایک عالی شان بنگلے کے مالک ہیں جن کے پاس سرکاری گاڑی ہے حفاظت کے لئے گنر اور گارڈز ہیں اور دنیا کی وہ ساری آسائشیں موجود ہیں جو میں ساری زندگی بہت سی رشوتیں لینے کے بعد بھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔۔۔

ہم وفا نہ کر سکے

میں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ چپراسی نے ایک پرچہ لا کر مجھے دیا۔ پرچے پر لکھے ہوئے نام نے وقت کے پہیئے کو اتنی تیزی سے پیچھے دوڑایا کہ میں دس سال کے عرصہ کو چند لمحوں میں پار کر گیا۔

سواریوں سے بھری ہوئی بس میں مجھے ایک سیٹ کیا مل گئی جیسے ہیرے جواہرات کی تھیلی ہاتھ لگ گئی تھی۔ دہلی کی بسوں میں روز ہی بھیڑ ہوتی تھی لیکن آج بھیڑ کچھ زیادہ ہی تھی۔ مخصوص اسٹاپ پر بس رکتی رہی۔ لوگ بدستور چڑھتے اور اترتے رہے۔ آئی ٹی او کے اسٹاپ پر اترنے والوں کی تعداد زیادہ تھی لیکن چڑھنے والوں میں صرف ایک قیامت تھی۔ سرخ سفید رنگت کی بلا نے دھانی رنگ کا سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ نازک سے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی سرخی نمایاں تھی۔ دہلی میں ہر لڑکی روزانہ ہی کچھ ایسے انداز سے تیار ہو کر نکلتی ہے جیسے کسی انٹرویو میں جا رہی ہو۔ ہوسکتا ہے وہ بھی کسی انٹرویو کے لئے نکلی ہو۔

بس کے اندر ایک خوشبو کے جھونکے کے ساتھ وہ داخل ہوئی اور اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اس نے بیٹھنے کی کوئی جگہ تلاش کی لیکن ہر سیٹ پر بیٹھی ہوئی سواریوں نے اسے دیکھا تو بڑے شوق سے لیکن اپنی جگہ دینے والا کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ دوسروں کی طرح وہ بھی چھت میں لگے ہوئے راڈ کو پکڑ کر سفر کرنے لگی۔

بس میں موجود ساری سواریوں میں یقیناً وہ سب سے زیادہ خوبصورت تھی اس لئے ہر

ایک کی توجہ اس پر ہونا لازمی تھی۔ میں نے بھی پوری دلچسپی کے ساتھ اسے دیکھا تھا۔ یہ بھی ایک اتفاق ہی تھا کہ میری سیٹ کے پیچھے ہی وہ کھڑی تھی۔ اس کی شخصیت کی گرمی اور وجود کی خوشبو نے اس تکلیف دہ سفر کو ایک خوشگوار سفر میں تبدیل کر دیا تھا۔

اس درمیان ڈرائیور نے تیز رفتار بس کو روکنے کے لئے پوری بریک لگا دی۔ اچانک بریک لگنے سے بھی سواریاں ہل کر رہ گئیں۔ بہت سے لوگ ایک دوسرے پر گر پڑے اور میرے گالوں پر جیسے کسی نے انگارا رکھ دیا۔ بے نیازی سے کھڑی ہوئی قیامت میرے اوپر آ کر گری تھی۔ بس پھر سے چلنے لگی۔ سواریاں ڈرائیور کو کوستے ہوئے پھر سنبھل کر بیٹھ گئیں۔ ہر سواری کی نظر اب اس پر سے ہٹ کر میرے اُوپر آ گئی تھی کیوں کہ اس کے ہونٹوں کی لالی اب میرے گالوں پر منتقل ہو چکی تھی۔

میں نے پلٹ کر اسے دیکھا جو شرمندہ سی پھر سے راڈ پکڑ کر کھڑی تھی۔ ہونٹوں کی سرخی اب ہلکی نظر آ رہی تھی۔ میں نے اپنے گال کو صاف کرنے کی کوئی فکر نہیں کی شاید اس خوشگوار لمحے کی لذت کو کچھ دیر تک باقی رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن میری طرف دیکھنے والے اب باقاعدہ مسکرا رہے تھے۔ میرے گالوں پر بنے خوبصورت ہونٹوں کے نشان انہیں رشک کرنے پر مجبور کر رہے تھے۔

وہ کبھی مجھے دیکھتی تو کبھی لوگوں کو جو مجھے اور اسے دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ شاید اسے توقع تھی کہ میں رومال سے اپنے گال کو صاف کر کے بات ختم کر دونگا لیکن میں اسی طرح بے نیاز بنا بیٹھا رہا جیسے مجھے کچھ خبر ہی نہیں کہ لوگ کیوں ہنس رہے ہیں۔

اگلے اسٹاپ پر بس رکتے ہی اس نے اپنے چھوٹے سے خوشبودار رومال سے میرے گال کو صاف کیا اور تیزی سے بس سے اتر گئی۔ یہ میری اور اس کی پہلی ملاقات تھی۔ دفتر پہنچنے پر مجھ سے انل کمار جی نے کہا کہ آج انٹرویو کے لئے چند لڑکیاں بلائی گئی ہیں میں کچھ دوسرے کاموں میں مصرو

ف رہوں گا آپ آفس کے لئے ایک منتخب کر لیجئے گا۔

تھوڑی دیر میں چپراسی نے انٹرویو دینے والوں کی آمد کی خبر دی۔ میں ایک ایک کو بلاتا رہا اور رسمی سوالات کے بعد ان کی درخواستیں جمع کرتا رہا۔ ابھی تک ایک بھی ایسی نہیں آئی تھی جو آفس کے ذمہ داریاں سنبھالنے کے لائق ہوتی۔ ایک جانی پہچانی خوشبو محسوس کر کے جیسے ہی میں نے سر کو اٹھایا تو دیکھا وہ سامنے کھڑی تھی۔ بے ساختہ میرا ہاتھ اپنے گالوں پر چلا گیا اور اس نے شرما کر گردن جھکا لی۔ اب کسی سوال اور جواب کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ نیرا ناگپال آفس اسٹینو کی حیثیت سے منتخب کر لی گئی۔

چند دنوں میں ہی مجھے یہ احساس ہو گیا کہ وہ صرف خوبصورت ہی نہیں بہت ساری صلاحیتوں کا مجموعہ بھی ہے۔ آفس میں اگر ہم اور انل جی نہ ہوتے تب بھی وہ آفس چلانے اور Sale (سیل) برقرار رکھنے کا فن جانتی تھی۔ ہم لوگوں کی غیر موجودگی میں آئی ہوئی کالوں کو اور سیلز انکوائری کو وہ بہت قاعدے سے ڈیل کرتی تھی۔

دھیرے دھیرے نیرا نے آفس کی ذمہ داریوں کے ساتھ میری بھی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ مجھے کب کہاں جانا ہے اس کی تفصیلات مجھ سے زیادہ نیرا کے پاس رہنے لگیں۔ نیرا کو یہ پتہ تھا کہ میں ریڈیو اور ٹی وی پروگراموں میں بھی شامل ہوتا ہوں۔ جس دن میری رکارڈنگ ہوتی وہ اپنی ننھی سی گھڑی بار بار مجھے دکھا کر یاد دلاتی کہ اب میرے جانے کا وقت ہو رہا ہے۔

میرے صاف ستھرے مزاج سے وہ اس حد تک واقف ہو چکی تھی کہ چپراسی اگر پانی کا گلاس مجھے پیش کرتا اور گلاس پر لگے پانی کے قطرے صاف نہ ہوتے تو وہ بڑھ کر گلاس لے لیتی اور اپنے آنچل سے صاف کر کے گلاس مجھے تھما دیتی۔

ہم لوگوں کی قربتیں آفس تک ہی محدود رہتیں۔ وہ مجھ سے پہلے دفتر سے اٹھ جاتی اور میرے آنے سے پہلے دفتر آجاتی۔ ایک دن ہم لوگ ساتھ ہی دفتر سے اٹھے واپسی کا روٹ تقریباً ایک ہی تھا اس لئے ساتھ ہی ساتھ بس اسٹاپ کی طرف جا رہے تھے کہ پیچھے سے کسی نے نیرا کو آواز دی۔ 'کیا گھر واپس جا رہی ہو؟'' 'جی ہاں''۔ نیرا نے بڑی بے دلی سے کہتے ہوئے مجھ سے کہا میرے کزن ہیں۔ 'چلو میں بھی چل رہا ہوں تمہیں ڈراپ کر دونگا۔ اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور پھر اس کی کار کی طرف بڑھ گئی۔

ہم لوگوں نے دفتر سے نکلتے وقت قطعی یہ پروگرام نہیں بنایا تھا کہ ایک ہی بس سے واپس چلیں گے۔ لیکن اس کے چلے جانے کے بعد نہ جانے کیوں دل اداس ہو گیا تھا۔ شاید میں اس کے ساتھ سفر کرنے کے خیال سے خوش تھا۔

دوسرے دن اس نے بلا وجہ مجھے صفائی دی کہ بادل ناخواستہ وہ اپنے کزن کے ساتھ جانے پر راضی ہوئی تھی۔ شاید بس میں میرے ساتھ سفر کرنے میں اسے زیادہ دلچسپی تھی۔ ہم لوگ دفتر میں اکثر لنچ ساتھ ہی کر لیتے تھے۔ میں اپنے ساتھ ٹفن لاتا تھا وہ بھی اپنا چھوٹا سا ٹفن کھول کر میرے ساتھ شریک ہو جاتی۔ اس کے ٹفن میں زیادہ تر چیزیں وہی رہتی تھیں جو مجھے پسند تھیں۔ پتہ نہیں اس کی پسند بھی وہی تھی یا میری خاطر وہ ایسی چیزیں بنا کر لاتی تھی۔

جب مجھ سے باتیں کرتی تو میں نظریں چرانے لگتا جسے وہ محسوس کر لیتی ایک بار اس نے مجھ سے کہا کہ 'آپ میری باتوں میں دلچسپی نہیں لیتے۔'' میں نے کہا تمہاری باتوں میں ہی نہیں تم میں بھی پوری دلچسپی لیتا ہوں۔' اب میں یہ کیسے کہہ دیتا کہ اس کی خوبصورت گردن دیکھ کر میں بہت مشکل سے اپنے آپ پر قابو رکھ پاتا ہوں۔ بہت سی حسین لڑکیاں میری نظر سے گزری تھیں

لیکن نیرا جیسی حسین گردن میں نے کسی کی نہیں دیکھی۔ لمبی سی گوری گردن کے بیچ میں سیاہ تل مجھے بے چین کر دیتا بس یہی دل چاہتا کہ اس تل کو چوم لوں۔

ایک دن جب اس نے بہت اصرار کیا تو میں نے سچ سچ بتا دیا کہ نیر آپ کی گردن کا تل بہت خوبصورت ہے اسے دیکھ کر نہ جانے کیا ہونے لگتا ہے۔ 'نیر! بہت اچھا لگا' نیر پکارنے پر وہ بہت خوش ہوگئی۔ لیکن تل والی بات کو گول کر گئی۔

ہم لوگ بڑی تیزی سے ایک دوسرے کے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ مجھے اب آفس پہنچنے کی جلدی ہوتی تو اسے دیر تک آفس میں بیٹھنا اچھا لگتا تھا۔ اچانک تین دنوں کے لئے وہ دفتر سے غائب ہوگئی۔ نہ کوئی خبر نہ کوئی اطلاع۔ دفتر کا کام بری طرح متاثر ہوگیا۔ جب سے نیرا نے دفتر سنبھالا تھا میں اور انل جی بے فکر ہو گئے تھے۔ ہر ضروری معلومات نیرا کے پاس رہتی تھی۔ ہر ضروری کاغذ کی وہ محافظ بن گئی تھی۔ ہمیں کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو وہ کسی کمپیوٹر کی طرح چند سکنڈوں میں بڑے سلیقے سے سامنے پیش کر دیتی۔ دفتر کے تو صرف کام متاثر ہو رہے تھے لیکن میں تو ادھورا ہو کر رہ گیا تھا۔ نیرا کی اب اتنی عادت پڑ گئی تھی کہ اس کے بغیر کام کرنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ کئی Appointment پر میں نہیں پہنچ سکا۔ میری ایک رکارڈنگ بھی مس ہوگئی۔ اپنی ننھی سی گھڑی دکھانے والی جو نہیں تھی۔ ٹفن تین دن سے ویسے ہی واپس جا رہا تھا۔ اکیلے کھانا کھانے کی جیسے عادت ہی ختم ہو چکی تھی۔

میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ نیرا کے بغیر زندگی بڑی پھیکی ہو کر رہ گئی ہے لیکن دل اقرار کرنے سے ڈر رہا تھا کہ میں بڑی شدت سے اسے چاہنے لگا ہوں۔ شاید مذہب کی دیوار سامنے تھی یا اس کے ماتحت ہونے کا لحاظ تھا۔ دفتر میں اس کے گھر کا پتہ اور فون نمبر موجود تھا لیکن یہ مناسب نہیں لگ

رہا تھا کہ اس کے گھر میں فون کر کے معلوم کیا جائے۔ شاید دل میں چور تھا ورنہ کسی بھی فائل کے بہانے فون کرنا کوئی معیوب بات تو نہیں تھی۔ یوں بھی وہ کمپنی کی نوکر تھی اور اسے جانے سے پہلے اطلاع دینی چاہئے تھی۔ ہو سکتا ہے انل جی کو بتا کر گئی ہو لیکن اسے سب سے پہلے مجھے بتانا چاہئے تھا آخر کیوں؟ بس اس کیوں نے ایک نئی بے چینی پیدا کر دی کیا میرے ساتھ اس کی وابستگی صرف آفس تک ہی ہے۔ مجھ میں اس کی دلچسپی صرف ایک ماتحت کا فرض ہے۔

میں نے تو اس سے نہیں کہا کہ میری ذمہ داریاں وہ سنبھالے۔ آفس سے متعلق جو بھی کام ہے اس کو کرنا اس کا فرض ہے لیکن میری نجی مصروفیات میں بھی اپنے کو شامل کر کے کیا اس نے فرض ادا کیا ہے۔ اگر یہی سچ ہے تو بہت تکلیف دہ ہے۔ میں اس سچائی کو کیسے برداشت کروں گا؟ اور اگر اس نے میری ذات میں دلچسپی لے رکھی ہے تو یہ بات سامنے کیسے آئے گی۔

یہی بات مجھے الجھاتی رہی اور وہ اپنی ساری حشر سامانیوں کے ساتھ چوتھے دن دفتر میں موجود تھی۔ نہ جانے کیوں میں آج مسکرا کر اسے 'ہلو' نہ کہہ سکا۔ مجھے دیکھ کر وہ کھڑی ہو گئی اور حسب معمول اس نے مسکرا کر گڈ مارننگ کہا میں نے بڑے ہی خشک لہجے میں صرف مارننگ کہہ کر اس کا جواب دے دیا۔ روز کی طرح 'ویری گڈ مارننگ' نہ سن کر وہ خاموش ہو گئی۔ شاید اس نے محسوس کر لیا تھا کہ تین دن کی غیر حاضری سے میں ناراض ہو گیا ہوں۔

'میں اپنی کزن کی شادی میں چلی گئی تھی۔ انل جی کو میں نے انفارم کر دیا تھا' اس نے اپنی صفائی پیش کی میں چپ رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے پھر کہا 'کیا آپ ناراض ہیں۔' 'نہیں اس میں ناراضگی کی کیا بات ہے۔ کمپنی کے مالک کو آپ نے اپنی غیر حاضری کی خبر دے دی تھی۔ بس فرض پورا ہو گیا۔' اس کے چہرے پر بڑی خوبصورت مسکراہٹ آئی جسے اس نے بخوبی کنٹرول کر لیا۔

کچھ دیر تک جب اس کی آواز نہیں آئی تو میں نے اس کی طرف دیکھا وہ کرسی کے سرہانے ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی۔ اس کی حسین گردن کا تل مجھے بے قرار کرنے کے لئے بالکل سامنے تھا میں نے جلدی سے اپنی نظر نیچے کر لی چند لحموں تک میں اپنے کو بہلاتا رہا اس کے بعد پھر اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ وہ نیم باز آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی مجھ سے نظر ملتے ہی وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ مجھے منانے کے لئے اس نے اس قاتل ادا کا سہارا لیا تھا۔ میں بھی شرمندہ سا ہنسنے لگا۔ 'آپ ناراض نہ ہوا کریں' یہ جملہ اتنے پیار سے ادا کیا گیا کہ میں وہ بات کہہ گیا جس کو کہنے کے لئے لوگ برسوں انتظار کرتے ہیں۔

کیا آپ نیرا ناگ پال سے نیرا مہدی بننا پسند کریں گی۔' وہ ایک دم سے چپ ہو گئی۔ شاید اس کو توقع نہیں تھی کہ میں کوئی ایسی بات کہوں گا۔ اس کی خاموشی دیکھ کر میں بھی چپ ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کہا 'کیا یہ ممکن ہے۔' اب اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور بڑی بڑی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ اپنی محبت کا اعتراف اب اس سے زیادہ کیا ہو سکتا تھا۔ میں نے کہا 'نیرا اگر دنیا میں ناممکن ممکن بنتا ہے تو صرف محبت کی خاطر'۔ جسے حسن، محبت اور اقرار مل جائیں اس کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔ میری خوشیاں بے قابو ہو گئیں۔

ہم لوگ اب اکثر دفتر کے بعد بھی ملنے لگے۔ کبھی کبھی چھٹی میں کسی پارک یا رسٹورنٹ میں ملاقاتیں ہو جاتیں۔ وہ میری خاطر اردو سیکھنے لگی۔ میں نے اسے ہندی سے اردو سیکھنے کی ایک کتاب لا کر دی۔ ایک دن اردو میں اس نے مجھے ایک چھوٹا سا خط لکھا۔ میں نے اس پرچے کو اپنے پاس اتنی حفاظت سے رکھا جیسے لاکھوں کی جائداد کا دستاویز ہو۔

ایک دن وہ سیاہ سوٹ میں دفتر آئی سفید میدے جیسی رنگت پر سیاہ رنگ ایسا لگا رہا تھا جیسے

چاند کو بادل چھپائے ہوں۔ بار بار میری نگاہ اس پر اٹھ جاتی تھی۔ اور وہ بڑے ناز سے مسکرا دیتی۔ لڑکیوں کے پاس مردوں کو لبھانے کی خداداد صلاحیت ہوتی ہے۔ انہیں یہ احساس بخوبی ہوتا ہے کہ انہیں کون کس نظر سے دیکھ رہا ہے۔ اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی میرے سامنے کردی۔ ہتھیلی پر مہندی سے **'نیرا مہدی'** لکھا ہوا تھا۔ میں نے اس کے نازک سے ہاتھ کو کچھ دیر کے لئے اپنی مٹھی میں چھپا کر چھوڑ دیا۔

نیر! آج ہم لوگ دفتر کے بعد بھی تھوڑی دیر رکیں گے آپ گھر فون کر دیجئے۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا پھر گھر پر فون کر دیا آج دفتر میں کچھ کام ہے اس لئے وہ دیر سے آئے گی۔ 'میں نے آج پہلی بار جھوٹ بولا ہے وہ بھی آپ کی خاطر' وہ شرمندہ سی نظر آرہی تھی 'یہ جھوٹ نہیں ہے اسے مصلحت کہتے ہیں۔'' اگر آپ سچ بتا دیتیں کہ یہ شام آج آپ میرے ساتھ گزاریں گی تو کہرام مچ جاتا۔ شاید آپ کو گھر بٹھا لیا جاتا۔ اب محبت کی ہے تو خطروں سے کھیلنا ہی پڑے گا۔' میں نے اسے بہلانے کی کوشش کی لیکن وہ خاموش ہی رہی۔ دفتر سے اٹھنے کے بعد ہم لوگ ایک پارک میں آگئے۔ پارک کا خوشگوار ماحول بھی اس کے موڈ کو ٹھیک نہ کر سکا۔ 'میرا ساتھ اگر آپ کو اچھا نہیں لگ رہا تو گھر چلتے ہیں۔' اب میں بھی سنجیدہ ہو گیا۔ 'میں نے اپنے نام کے ساتھ آپ کا نام صرف آپ کو خوش کرنے کے لئے نہیں جوڑا ہے۔ بہت سوچ سمجھ کر ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد جب یہ سمجھ میں آگیا کہ زندگی میں پہلی اور آخری بار اس دل نے کسی کو بے انتہا چاہا ہے تو آپ کے نام کو اپنے نام سے جوڑ لیا۔ اب تو میرا دل و دماغ احساس جذبات سب کچھ آپ کی محبت سے جڑ چکے ہیں۔ ہاں ساغر اب ہم کسی اور کے قابل ہی نہیں رہے۔' آج پہلی بار اس کے زبان پر میرا نام آیا تھا۔

'آپ اتنی اچھی باتیں بھی کر لیتی ہیں۔' میں نے بے ساختہ اسے بانہوں میں بھر لیا۔ اس

نے اپنے کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن میری باہوں سے آزاد نہ ہو سکی۔ میں نے اس کی گردن کے تل کو چوما اور پھر اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ وہ ایک جھٹکے سے الگ ہو گئی۔

'آپ بھی ویسے ہی نکلے جیسے سب مرد ہوتے ہیں۔ آپ اسی لئے پارک میں لائے تھے کہ میری پاکیزگی کو داغدار کر دیں۔' وہ بپھر گئی۔ میں نے ماحول کو خوشگوار کرنے کے لئے کہا 'ایک بار تم نے مجھے چوما تھا آج میں نے چوم لیا بات برابر۔ ہاں میں نے ایک کے بدلے دو پیار کئے ہیں۔ تم چاہو تو بدلہ لے سکتی ہو۔'' آپ نے اچھا نہیں کیا۔ میں آپ کو ان گھٹیا باتوں سے اوپر کا انسان سمجھتی تھی لیکن دوسروں کی طرح آپ بھی اسی کیٹیگری کے ہیں جنہیں پھول بننے سے پہلے کلیاں توڑنے میں مزہ آتا ہے۔ کھانا پکنے سے پہلے کھا لینے میں لطف آتا ہے۔ اور لڑکیوں کو محبت کا چھانسا دے کر لوٹنے میں لذت ملتی ہے۔' اس کا چہرہ سرخ ہوا جا رہا تھا اور وہ بولے جا رہی تھی۔

میرے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا۔ میں نے اسے پیار ضرور کیا تھا لیکن کسی بری نیت سے نہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی بھی خوبصورت چیز کو حاصل کرنے کے بعد چوم لیا جاتا ہے اور آخر وہ میری ہی تو تھی۔ میں نے کہا 'نیرا آپ حد سے بڑھ گئی ہیں۔ آپ نے مجھ سے محبت کی ہے تو کوئی احسان نہیں کیا ہے۔ میری بے پناہ محبت کا جواب دیا ہے۔ آپ کی خوبصورتی دیکھ کر اگر میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا تو یہ میری جذباتیت ہو سکتی ہے لیکن آپ نے جس طرح میری توہین کی ہے وہ مناسب نہیں تھا۔ آپ نے مجھے بہت دکھ دیا ہے۔ یہ کہہ کر میں واپسی کے لئے مڑ گیا۔' اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بھی میرے پیچھے پیچھے پارک سے باہر آ گئی۔ سڑک پر آ کر اس نے ایک آٹو کیا اور اکیلے ہی چلی گئی۔

جو شام ہم لوگوں کی بہت خوشگوار ہونی چاہیے تھی وہ آخری یادگار شام بن کر رہ گئی۔

دوسرے دن آفس میں اس کا استعفیٰ آ گیا۔ اس کے استعفیٰ سے انل جی بھی چونکے۔ مجھ سے وجہ پوچھی میں نے لاعلمی کا اظہار کر دیا۔ ایک ہفتہ کے بعد مجھے دبئی میں ایک اچھا آفر مل گیا جسے قبول کرنے میں میں نے ذرا بھی دیر نہیں لگائی۔ اس شہر کو میں جلد سے جلد چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ یہاں کی فضا میں میری اور نیرا کی محبت کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ دبئی جانے سے پہلے بہت دل چاہا کہ اس سے ایک بار مل لوں یا فون پر بات کرلوں لیکن یہ سوچ کر بات نہیں کی کہ اگر اس نے بات کرنے سے انکار کر دیا تو یہ بھرم بھی ٹوٹ جائے گا کہ مجھ سے دور رہ کر وہ بھی بے چین ہے۔ دل پر پتھر رکھ کر میں دبئی روانہ ہو گیا۔ وہاں کی خوشگوار زندگی اور جاب کی مصروفیت نے مجھے اس حد تک گھیر لیا کہ بیتا ہوا کل صرف ماضی کا ایک حصہ بن کر رہ گیا۔ کبھی کبھی نیرا کی یاد آتی تو دل اداس ہو جاتا۔ لیکن پھر زندگی معمول پر آ جاتی۔

میری صلاحیت اور محنت نے مجھے اپنے کفیل سے اس حد تک قریب کر دیا تھا کہ اپنی موت سے پہلے اس نے نہ صرف اپنا پورا کاروبار میرے حوالے کر دیا بلکہ اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی بھی مجھ سے کر دی۔ سائرہ کا ساتھ اگر بہت اچھا نہیں تھا تو بہت برا بھی نہیں تھا۔ بڑی خوبیوں والی لڑکی تھی۔ میرا بہت خیال رکھتی تھی۔ اب صورت اور شکل تو اللہ کی بنائی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کی صورت بھی اچھی خاصی تھی۔ اب یہ بات دوسری ہے کہ تندرستی نے اس کے نقوش کو ہی چھپا کر رکھ دیا تھا۔ اسی میں اس کی گردن بھی کھو گئی تھی۔ جسے دیکھ کر مجھے نیرا یاد آ جاتی اور پھر اس کی گردن کا تل۔

سائرہ کا ساتھ بھی میری قسمت میں نہیں تھا۔ شادی کے دو سال بعد ہی ایک سڑک حادثہ میں وہ ساتھ چھوڑ گئی۔ اب دبئی میں میرا دل گھبرانے لگا۔ میری کمپنی کا ایک آفس انڈیا میں بھی تھا جسے میں نے ہیڈ آفس بنا لیا اور انڈیا میں شفٹ ہو گیا۔ اب اپنے شہر میں میری حیثیت ایک ٹاپ کلاس

بزنس مین کی تھی۔ گاڑی بنگلہ اسٹیٹس سب کچھ میرے پاس تھا۔ اور جس کے پاس یہ سب کچھ ہوتا ہے اس سے دو کام ضرور لیئے جاتے ہیں۔ ایک تو کسی فنکشن کی صدارت یا کسی ادارے کا افتتاح دوسرے کسی چندے کی ڈیمانڈ۔ میرے پاس بھی لوگ اسی غرض سے آتے رہتے تھے۔

چپراسی نہ جانے کب سے میرے انتظار میں کھڑا تھا کیوں کہ پرچے پر لکھے نام کو دیکھ کر میں ماضی میں بہت دور تک چلا گیا تھا۔ میرے ہاتھ میں جو پرچی تھی اس پر 'نیر امہدی' لکھا ہوا تھا۔

میں نے تو اس کی یاد کو یاد ماضی بنا کر رکھا تھا لیکن اس نے ایک لمحے کے لئے بھی مجھ کو خود سے جدا نہیں کیا تھا۔ ایسی وفا ایسا ایثار میں ایک بار پھر سے شرمندہ ہونے کے لئے تیار ہو گیا۔ میں نے چپراسی سے کہا ''بھیج دو'' اس کے بعد اپنی کرسی کا رخ میں نے دروازے سے پھیر کر اس آئینہ کی طرف کر لیا جو مجھے کمرے میں داخل ہونے والے ہر فرد کی خبر دیتا تھا۔

وہ ہلکی گلابی ساڑی میں اندر داخل ہوئی۔ ۱۰ سالوں میں صرف ایک معمولی سی تبدیلی اس میں آئی تھی وہ یہ کہ اس کی خوبصورت آنکھوں پر چشمہ لگ گیا تھا۔ جس نے اس کے حسن کو باوقار بنا دیا تھا۔ میرے بڑے سے سجے سجائے آفس کو وہ حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی شاید اسے تلاش کر رہی تھی جس سے ملنے آئی تھی۔

میں نے رخ پھیرے ہوئے ہی کہا ''بیٹھ جائیے''۔

وہ گھبرا کر جلدی سے میز کے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اب میں نے اپنی کرسی کا رخ اس کی طرف موڑتے ہوئے کہا ''فرمایئے کیا خدمت کرسکتا ہوں''۔

اس نے مجھے دیکھا اور ایک دم سے کھڑی ہوگئی۔ ''آپ! آپ یہاں۔'' فیصل

کارپوریشن کے چیئر مین سے ملاقات کرنی ہے۔'' ''کیجئے ملاقات۔''

''یعنی آپ ہی چیئر مین ہیں۔''

''جی ہاں فیصل کارپوریشن کا میں ہی چیئر مین ہوں۔''

اس بیچ وہ اپنے آپ پر قابو پا چکی تھی۔

''میں ماڈل اسکول سے آئی ہوں۔ اسکول کی پرنسپل سے آپ کی بات ہو چکی ہے۔ وہ ہمارے اسکول کے سالانہ جلسے میں آپ کو مہمان خصوصی بنانا چاہتی ہیں۔ ان کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی ہے ورنہ وہ خود تشریف لاتیں۔''

بڑی شستہ اردو میں وہ گفتگو کرنے لگی تھی۔

''آپ ماڈل اسکول میں ٹیچر ہیں۔''

اس نے بڑے ہی خشک لہجے میں جواب دیا ''جی ہاں''۔

اب وہ پھر سے پرانی نیرا بن چکی تھی۔

''میں وہاں پڑھاتی ہوں۔''

''تو میں چلوں۔'' اب وہ اٹھنے لگی۔

''آپ میرا جواب لئے بغیر چلی جائیں گی۔''

کئی سال بعد اسے قریب پا کر مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ وہ اسی طرح بیٹھی رہے۔ وہ پھر بیٹھ گئی۔

''آج ہم لوگ دس سال بعد ملے ہیں نیر کچھ دیر بیٹھئے۔'' میں نے اس سے التجا کی۔

''میرا نام نیرا مہدی ہے۔'' اس نے بڑی رکھائی سے کہا۔

''اوہ ہاں! تو میڈم مہدی میں یہ کہہ رہا تھا کہ کیا آپ کی بھی خواہش ہے کہ میں آپ کے

اسکول کے فنکشن میں مہمان خصوصی رہوں؟''

میڈم مہدی کہنے پر اس کے چہرے پر بےچینی کے آثار دکھائی دیئے۔شاید وہ بھی ماضی کی یادوں سے گھبرا رہی تھی۔

اس نے بہت غور سے مجھے دیکھا پھر بہت صاف گوئی سے کہنے لگی جی نہیں۔

''کیوں؟''

مجھے اس کے انکار پر حیرت ہوئی۔

''دراصل آپ کے نام کا آخری حصہ میرے لئے پریشانیاں کھڑی کردیگا۔''

وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔

نیرا ''میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''میں اب اس کا سامنا کرنے کو تیار ہو چکا تھا۔

''مسٹر چیئرمین میں اپنے اسکول کی پرنسپل کا پیغام لے کر آپ کے پاس آئی تھی اور میں نے پہنچا دیا۔اب واپس چلوں گی۔''وہ پھر کھڑی ہو

گئی۔میرا نام بھی اب لینے سے گریز کر رہی تھی۔

نیرا ایک بار پہلے بھی آپ کے اسی رویہ نے ہم لوگوں کو دس سال کے لئے ایک دوسرے سے دور کر دیا تھا آج آپ پھر وہی رویہ اختیار کریں گی تو شاید ہم لوگ ہمیشہ کے لئے اجنبی بن کر رہ جائیں گے۔'وہ بے بسی سے میری طرف دیکھنے لگی اور پھر بیٹھ گئی۔

''آپ یہی کہیں گے نہ کہ دبئی جاتے وقت میرے پاس وقت نہیں تھا کہ تم سے مل لیتا اور دس سال تک اتنا مصروف رہا کہ تمہیں یاد کرنے کی فرصت ہی نہ نکال سکا۔''میری اتنی ہی تو خطا تھی کہ میں اپنے آپ کو سورج کی پہلی کرن کی طرح پاک اور صاف رکھنا چاہتی تھی۔کس کے لئے؟

صرف آپ کے لئے مجھے وہ لڑکیاں پسند نہیں ہیں جو بال پڑے ہوئے آئینے میں اپنی تصویر دیکھتی ہیں۔اور یہ توقع کرتی ہیں کہ حسین نظر آئیں۔ میں نے سوچا تھا کہ دل کی دھڑکن پر آپ کا نام لکھ چکی ہوں ہر سانس آپ کے حوالے کر چکی ہوں۔ ہر لمحے آپ کی یاد سے تروتازہ رکھتی ہوں اب ایک جسم ہی بچا ہے جو ہر آلودگی سے پاک ہے اسے شادی کے بعد آپ کے حوالے کروں گی۔"

وہ سانس لینے کے لئے رکی اس کے بعد پھر شروع ہوگئی۔

"آپ نے پارک میں جو کچھ کیا تھا وہ شاید آپ کی نظر میں بڑی بات نہ ہو ساری دنیا یہی کرتی ہے لیکن میں کیا کروں مجھے ایسا لگا جسے میری پاکیزگی میں بال آگیا۔ میرے پاکیزہ خیالات کو ٹھیس لگ گئی مجھے یہ سوچ کر غصہ آگیا کہ مندر میں چڑھنے سے پہلے آپ نے پرساد کو چکھ لیا۔ آپ کے ہر انداز میں ایک نیا پن تھا۔ ایک دلکشی تھی۔ آپ دوسروں سے بالکل الگ لگتے تھے اس لئے آپ سے محبت کرتے کرتے میں بھول گئی تھی کہ آپ بھی ایک انسان ہیں۔ میں ایک دیوتا کی طرح آپ کی پوجا کرنے لگی تھی۔ اب آپ خود ہی بتائیں جب ایک دیوتا انسان کے روپ میں نظر آئے گا تو دکھ نہیں ہوگا'

تھوڑی دیر سانس لیکر اس نے پھر کہنا شروع کیا 'اس شام کو گھر لوٹنے کے بعد میں رات بھر سوئی نہیں۔ میری نظر میں آپ کی امیج ہی نہیں گری تھی بلکہ میرے دیوتا کی مورتی ٹوٹ گئی تھی۔ میں نے طے کیا تھا کہ اب آپ کا سامنا نہیں کروں گی اس لئے دفتر جانے کے بجائے میں نے اپنا استعفیٰ بھیج دیا' اس کی آنکھوں سے آنسوں جاری تھے اور وہ بولے جارہی تھی۔ میں اپنی کرسی قریب کر کے اسے بولتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میں چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے دل کا سارا غبار نکال لے۔ اس کے بعد میں کچھ کہوں۔

تھوڑی دیر کے لئے وہ چپ ہو کر میرا ردعمل دیکھتی رہی۔ مجھے خاموش دیکھ کر اس نے پھر بولنا شروع کیا 'چند روز کے بعد جب میں کچھ نارمل ہوئی تو میں سوچا کہ آپ نے صرف مجھے پیار ہی تو کیا تھا۔ اور پیار کرنا کوئی ایسی بری بات تو نہیں مجھے بھی جب کوئی چیز اچھی لگتی ہے تو میں بھی تو چوم لیتی ہوں۔ آپ کے ساتھ میں گھنٹوں اکیلی رہی ہوں آپ اگر عام آدمی ہوتے تو کچھ بھی کر سکتے تھے۔ میں کیا کر لیتی۔ لیکن آپ نے اپنے آپ سے بھی میری حفاظت کی تھی۔ ذرا سی بات پر میں نے آپ کی کتنی بے عزتی کر ڈالی تھی۔ آپ کے جیسے خوددار آدمی نے مجھے نہ منا کر اپنا وقار بنا کر رکھا تھا۔ جب میں نے آپ سے معافی مانگنے کے لئے دفتر فون کیا تو معلوم ہوا کہ آپ مجھ سے ہی نہیں بلکہ ملک سے ہی دور چلے گئے ہیں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کہیں سے آپ کا پتہ مل جائے تو آپ کو خط لکھوں لیکن مجھے کہیں سے بھی آپ کا پتہ نہیں مل سکا۔ سال بھر کے بعد پاپا کی موت ہو گئی تو نوکری کرنا میری مجبوری ہو گئی۔ لیکن جہاں بھی نوکری کرتی تو میری صورت میرے لئے مصیبت بن جاتی۔ کبھی کمپنی کا مالک مجھ پر عاشق ہوتا تو کبھی مینیجر محبت نامے بھیجنا شروع کر دیتا۔' 'نیرا آپ نے شادی کیوں نہیں کر لی؟' میں نے بیچ میں اسے ٹوک دیا۔ 'آپ مجھے کبھی نہ سمجھ سکیں گے۔ میرے پاس کیا تھا جو کسی کو دیتی۔ میرے پاس جو کچھ تھا وہ تو کسی کی امانت تھی بھلے ہی وہ زندگی بھر نہ مانگے لیکن مجھے تو اس کی حفاظت کرنی ہی تھی۔' اس نے پھر نظریں جھکا کر بولنا شروع کیا 'میں نے ماڈل اسکول میں نیرا مہدی کے نام سے نوکری شروع کر دی۔ اسکول میں سب کو پتہ ہے کہ میرے شوہر مسٹر مہدی دبئی میں ہیں۔' یہ کہتے ہوئے وہ شرما گئی۔ 'اب آپ میرے اسکول آئیں گے تو مجھ سے دس سوال ہونگے کہ یہ کون ہیں۔'

اپنی ساری باتیں کہہ کر وہ اب اس طرح بیٹھی تھی جیسے میرے فیصلے کے انتظار میں ہو۔ اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس عظیم ترین لڑکی کے سامنے میں کس طرح اپنی بے وفائی کی داستان رکھوں۔

میں کیسے کہوں کہ میں تمہیں بھولا ہی نہیں تھا بلکہ میں نے شادی بھی کی تھی۔

'نیر محبت کی جس بلندی اور وفاداری کے جس آسمان پر آپ کھڑی ہیں میں اس کے چوکھٹ تک بھی نہیں آسکا۔ جس کے لئے میں شرمندہ ہوں۔ اب آپ جو چاہیں سزا دیں لیکن میں آپ سے سچ نہیں چھپاؤں گا۔ میں آپ سے مل کر ہی جانا چاہتا تھا لیکن یہ سوچ کر نہیں ملا کہ کہیں آپ ملنے سے انکار نہ کر دیں۔'' دبئی میں بے شک میں کھو گیا تھا۔ وہاں میں نے کافی دولت کمائی میری کمپنی کے مالک نے مجھے اپنی دولت کا مالک ہی نہیں بنایا بلکہ اپنی بیٹی کا بھی وارث بنا دیا۔' اس کے چہرے پر ایک تاریک سایہ دکھائی دیا جسے اس نے قابو میں کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ میں چند لمحوں تک اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھتا رہا پھر اسے بتا دیا کہ میری بیوی ایک کار حادثہ میں ختم ہو گئی۔ اس کا چہرہ اب سپاٹ تھا۔ شاید میری شادی کی خبر سے جو دکھ پہنچا تھا وہ میری بیوی کی موت کے بعد بھی قائم تھا۔

میں اپنی کرسی سے کھڑا ہو کر اس کے قریب آ گیا اور رخ موڑ کر پھر بولنے لگا نیرا میں نے زندگی کے ان دس سالوں میں دنیا کا ہر سکھ پا لیا لیکن دل میں ایک اضطراب تھا جو کسی طرح ختم نہیں ہوتا تھا۔ آپ کے ساتھ دفتر میں ٹفن کھانے میں جو مزہ ملتا تھا وہ بڑے سے بڑے ہوٹل کے کھانے میں بھی نہ مل سکا۔ میں سمجھتا تھا کہ دبئی میں گزارے ہوئے وقت میں آپ کو بھول چکا ہوں لیکن آج آپ کو دیکھ کر جو راحت ملی ہے وہ یہی کہہ رہی ہے کہ ہر سکھ کے پیچھے جو بے چینی تھی وہ صرف اور صرف نیرا کے نہ ہونے سے تھی۔ سب کچھ سچ سننے کے بعد کیا آپ مجھے معاف کر سکیں گی۔' میں نے اس سے التجا کی۔ نیرا نہیں نیر نہ جانے کب وہ میرے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا سچ! مُچ کہہ کر وہ بے ساختہ مجھ سے لپٹ گئی۔۔۔

بُرقعہ والی

عیدو کی موت کو آج دو سال پورے ہو چکے تھے۔ اس بیچ سائرہ نے جس طرح ایک بیوہ کی زندگی گزاری تھی وہ اپنے آپ میں ایک مثال تھی۔ سائرہ نے کبھی بھی گھر والوں کو شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ غریب گھروں میں سماج اور مذہب کا کچھ زیادہ ہی خیال رکھا جاتا ہے۔ خاص طور پر عورتوں کو غلام بنا کر رکھنے کے لیے بار بار مذہب کی زنجیروں کی دہائی دیکر جکڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ عدت کے تین مہینہ دس دن پورے ہونے کے بعد بھی سائرہ نے اپنے آپ کو ایک قیدی سمجھ کر زندگی گزاری تھی۔ گھر کے کام کاج کے بعد اپنے چھوٹے سے کمرے میں آکر عیدو کی یادوں میں کھو جاتی۔ شادی شدہ زندگی کے ایک سال کب شروع ہوئے اور کب ختم ہو گئے پتہ ہی نہیں لگا اور اس کو یاد کرنے میں زیادہ وقت بھی نہیں لگتا تھا۔ لیکن سائرہ کے پاس پرانی یادوں کو دوہرانے کے سوا دوسرا کوئی کام بھی تو نہ تھا۔

انٹر تک پڑھی سائرہ کے لئے جب ہائی اسکول فیل عیدو کا رشتہ آیا تو وہ بہت دیر تک روتی رہی تھی۔ ہر لڑکی کی طرح اس نے بھی کچھ خواب سجائے تھے بہت شاندار نہیں تو چھوٹی موٹی نوکری کرنے والے دولہا کی تمنا کر کے اس نے کوئی پاپ نہیں کیا تھا۔ چوک میں ایک پان کی دکان کے مالک عیدو کو جب اپنا سرتاج بنا لینے کو اس کے باپ نے کہا تو اس نے باپ کے چہرے پر پھیلی ہوئی بے بسی کو بہت غور سے دیکھا تھا۔ سائرہ نے بس اتنا ہی کہا کہ: ''جو آپ کی مرضی''۔ وہ یہ بھی نہ کہہ سکی کہ آپ ایک ایسے لڑکے سے میری شادی کر رہے ہیں جو اپنے نام کی حفاظت بھی نہ کر سکا۔ وہ عدنان سے عیدو بنا دیا گیا اور اس پر احتجاج تک نہ کیا۔ سائرہ نے اتنا ضرور دیکھا کہ کمرے سے باہر

جاتے وقت اس کے والد اپنی بھیگی آنکھوں کو پوچھ رہے ہیں۔

رحمت حسین تحصیل میں کلرک تھے۔ اللہ نے دولت کے بدلے میں اولاد کی نعمت سے انہیں مالا مال کیا تھا۔ دو بیٹوں اور چار لڑکیوں کے علاوہ بوڑھے ماں باپ کی ذمہ داری بھی رحمت میاں کے سر پر تھی۔ ہر غریب کی طرح رحمت میاں کی آمدنی کم اور خرچ زیادہ تھا۔ اس فکر اور پریشانی کو جب بھی انہوں نے بیوی کے ساتھ بانٹنے کی کوشش کی تو ہر بار ایک بچے کا اضافہ ہوتا گیا۔ اب ایسی صورت حال میں لڑکیوں کے لئے اچھا رشتہ تلاش کرنے کی ان کی بساط نہیں تھی۔

سائرہ گھر کی سب سے بڑی اولاد تھی وہ ماں باپ کے بوجھ کو اگر بانٹ نہیں سکتی تھی تو کم سے کم ہلکا تو کر ہی سکتی تھی۔ یہی سب سوچ کر سائرہ عیدو کی دلہن بن کر اپنے گھر سے رخصت ہو گئی۔ سائرہ نے تعلیم تو صرف انٹر تک حاصل کی تھی لیکن زندگی کو بہت قریب سے دیکھا تھا اپنے گھر کی پریشانیوں کو جہاں اس نے محسوس کیا تھا وہیں اولاد کی کثرت کو ایک سنگین مسئلہ بھی سمجھا تھا۔ اس لئے اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ بچے پیدا کرنے میں جلد بازی نہیں کرے گی۔

پڑھی لکھی اور خوبصورت بیوی پا کر جہاں عیدو پھولے نہیں سماتا تھا وہیں سائرہ کی خدمت اور صلاحیتوں نے گھر کے باقی لوگوں کو اس کا گرویدہ بنا رکھا تھا لیکن کم پڑھے لکھے گھر میں ایک سال بعد بھی بہو کا پیر بھاری نہ ہونا اتنا بڑا گناہ ہوتا ہے کہ اسے کوئی معاف کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ وہی بہو جو کل تک سب کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھی اب کانٹا بن کر سب کو چبھنے لگی۔ اماں تو اٹھتے بیٹھتے گود کے سونی ہونے کا طعنہ دیتی رہتیں۔ دیور لڈن میاں بھابھی سے پھوہڑ مذاق کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔ ''بھیا میں اگر کچھ کمی ہے تو میری خدمت لے لیا کیجئے۔'' یہ کہہ کر لڈن میاں آنکھوں سے ہی سائرہ کے کپڑے اتارنے کی کوشش کرتے اور سائرہ شرم سے پانی پانی ہو جاتی۔ سائرہ کو شرماتے دیکھ کر پورا گھر قہقہوں میں ڈوب جاتا۔ ابا میاں بھی اس قسم کے مذاق پر بیٹے کو منع

کرنے کے بجائے ہنسنے والوں میں شامل رہتے۔ شائدان کی نظر بھی بہو کے گداز جسم پر لگی رہتی تھی۔

عیدو نے ایک دن سائرہ سے کہا کہ اب ہماری شادی کو بہت دن ہو گئے ہیں ایک بچہ ہو جائے تو بہتر ہے۔ اس کے جواب میں سائرہ نے عیدو کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے کہا کہ ''کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہمارا بچہ بھی آپ کی طرح پان کی دکان پر بیٹھے۔ اتنا پیسہ کمانے لگیے کہ ہم اپنے بچے کی عمدہ پرورش کر کے اسے اعلیٰ تعلیم دلا سکیں۔ جس دن حالات ٹھیک ہو گئے اسی دن سے احتیاط بند۔ آپ پوری طرح آزاد ہونگے''۔ یہ کہہ کر کے سائرہ نے کمرے کی بتی گل کر دی۔ اس رات کے بعد سائرہ کی زندگی کی بتی بھی گل ہو گئی۔ دکان جاتے وقت عیدو کو ایک کار نے ایسی ٹکر ماری کہ بچے کے باپ کی تمنا لئے ہی وہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

عیدو کی موت کے بعد سائرہ کی زندگی میں اندھیرا چھا گیا۔ عیدو جیسا بھی تھا اس کا شوہر تھا۔ اس کا پورا خیال رکھتا تھا۔ وہ بھی عیدو کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ عیدو اور سائرہ کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا لیکن سائرہ نے کبھی بھی ایک اچھی بیوی کا فرض نبھانے میں کوتاہی نہیں کی۔ عیدو کی موت کے بعد اپنی سسرال میں ہی وہ پرائی ہو گئی۔ ایک سال میں بچہ نہ ہونے کے سبب اس پر بانجھ کا الزام پہلے ہی لگایا جا چکا تھا۔ عیدو کی موت کے بعد منحوسیت کا کلنک بھی اس کے ماتھے پر جڑ دیا گیا۔ سائرہ کو منحوسیت کی سزا دینے کے لئے دو ایک بار لڈن میاں نے آدھی رات کے وقت اس کے کمرے میں گھسنے کی کوشش بھی کر ڈالی جس کی شکایت اس نے ابا جی اور اماں جان سے کی۔ لیکن اس کو یہی سننے کو ملا کہ اگر جوانی نہیں کٹ رہی ہے تو جا کر کسی کوٹھے پر بیٹھ جاؤ یا کسی کنویں میں ڈوب مرو گھر کے مردوں کو کیوں بدنام کر رہی ہو۔ نوجوان بہو کی دوسری شادی کرا کر اس کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا فرض نبھانے کا جذبہ کسی میں نہیں تھا۔ کافی غور و فکر کے بعد اس نے طے کیا کہ وہ اپنی محنت سے دو پیسہ کمائے گی۔

دو سال سے کھونٹی پر ٹنگی عیدو کی دکان کی چابی جیسے ہی اس نے اتاری پورے گھر میں زلزلہ آ گیا۔ ابا جی نے پوچھا ''کہاں جا رہی ہو''۔ ''آج سے میں دکان پر بیٹھوں گی۔'' سائرہ کی آواز میں اتنی پختگی تھی کہ ابا جی کچھ دیر تک بول ہی نہ سکے۔ ''تم ہوش میں تو ہو'' عورت ذات بیچ بازار میں پان کی دکان پر بیٹھے گی۔'' ''کیوں اس میں برائی کیا ہے۔'' عورت کھولی میں بیٹھ کر اپنا جسم بیچ سکتی ہے، ہوٹلوں میں ننگی ہو کر ناچ سکتی ہے، شراب خانوں میں مردوں کو شراب پروس سکتی ہے، اپنے گھر میں اپنے ہی دیور سے اپنی عزت بچا سکتی ہے تو اپنے میاں کی دکان پر بیٹھ کر پان کیوں نہیں بیچ سکتی۔'' سائرہ کا لہجہ ابھی بھی سخت تھا لیکن اس نے نگاہیں نیچی رکھ کر اپنی بات مکمل کی۔

پہلی بار بازار والوں نے کسی برقعہ والی کو بازار میں پان بیچتے ہوئے دیکھا تو دکان پر بھیڑ لگ گئی۔ ہر عمر کے مردوں میں پان کا شوق بڑھ گیا۔ کچھ یہ سمجھ کر آنے لگے کہ پان کی دکان تو ایک بہانا ہے اس کے پیچھے کچھ اور ہی فسانہ ہے۔ لیکن ان کی امیدوں پر برابر پانی پڑتا گیا اور جب کئی مہینے گزر جانے کے بعد بھی برقعہ والی کے پان بنانے والے ہاتھوں اور برقع سے جھانکتی ہوئی آنکھوں کے علاوہ کچھ نہ دیکھ سکے تو پان کھانے والوں کی تعداد کم ہو گئی۔ عیدو کے ابا میاں نے خود مایوس ہو کر محلے کے مولوی صاحب کو سائرہ کو سمجھانے کے لئے میدان میں اتارا لیکن مولوی صاحب کی زبان بھی سائرہ نے یہ کہہ کر بند کر دی کہ ''ایک بیوہ کی کفالت کی ذمہ داری اس کے سسرال والوں پر ہوتی ہے اگر وہ لوگ اپنی ذمہ داری سنبھالنے میں ناکام ہوں تو عورت کیا کرے۔؟'' عورت کو محنت کر کے اپنا پیٹ پالنے پر اگر اسلام نے پابندی لگائی ہو تو مجھے بتا دیجئے میں پان کی دکان پر بیٹھنا بند کر دوں گی۔'' اس کے اس جواب کے بعد مولوی صاحب نے بھی کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔

ایک دن وہ بھی آیا جب سائرہ کی کمائی سے گھر کا خرچ چلنے لگا عیدو کے چھوٹے بھائی لڈن

میاں ناکارہ ہی رہ گئے اور ابا جی کی پنشن اتنی کم تھی کہ اس سے گھر کا چلنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہی سائرہ جس کو گھر والے کنویں میں کودنے یا کوٹھے پر بیٹھنے کا مشورہ دے رہے تھے آج پورے گھر پر راج کر رہی تھی۔ چھوٹی نند کی شادی اور ساس سسر کے حج کے خرچ کو سائرہ نے ہی برداشت کیا تھا۔ سائرہ اب خود مختار تھی اسے کچھ بھی کرنے کی آزادی تھی کئی بار اس کا دل چاہا کہ بچی کھچی زندگی گزارنے کے لئے کسی کا ہاتھ پکڑ لے لیکن یہ سوچ کر اس نے تنہا زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا کہ مردوں کے دل سے یہ بات نکل جائے کہ بغیر مرد کے ایک اکیلی عورت زندگی نہیں گزار سکتی۔۔۔

بہت دیر ہوگئی

مہربانی کر کے آپ اپنی سیٹ پر لگی بیلٹ باندلیں بس چند لمحوں میں ہمارا جہاز دہلی کے ایئر پورٹ پر اترنے والا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں آپ ہندستان کی خوشگوار فضا میں سانس لے رہے ہوں گے۔ ائیر ہوسٹس کی سُریلی آواز کا دوسروں پر جو بھی اثر ہوا ہو سمیر کو ایسا لگا جیسے ائیر ہوسٹس نے اسے پوری دنیا کا بادشاہ بنائے جانے کی خوشخبری سنادی۔

ہندستان پہنچنے کی خوشی بیوی بچوں سے ملاقات کا تصور سمیر کے لئے کتنا خوشگوار تھا اس کو صرف وہی محسوس کر سکتا تھا۔ وطن پہنچنے کی خوشی کس کو نہیں ہوتی لیکن سمیر یہ سوچ رہا تھا کہ پورے جہاز میں سب سے زیادہ خوش نصیب مسافر وہی ہے۔

ہندستان میں سمیر کی بیوی روبینہ بیٹی نیہا اور بیٹا سونو اس وقت کیا کر رہے ہوں گے یہ تو اس کو پتہ نہیں تھا لیکن جس حال میں وہ انہیں چھوڑ کر آیا تھا ان پرانی یادوں کو تازہ کرنے کا موقع اسے مل گیا تھا۔

"پاپا میرا جوتا بالکل پھٹ گیا ہے مجھے نیا جوتا لا کر دیجئے ورنہ میں اسکول نہیں جاؤں گا۔"
ابھی سونو اپنی بات پوری بھی نہیں کر پایا تھا کہ نیہا نے کہا "پاپا میری ساری سہیلیوں کے پاس بے بی ڈال ہے اور میرے پاس کوئی گڑیا نہیں ہے۔ میرے لئے ایک گڑیا لا دیجئے نا۔"
بچوں کی اس طرح کی چھوٹی موٹی فرمائش وہ روز سنا کرتا تھا۔ کبھی ہنس کر تو کبھی جھوٹے وعدوں سے انہیں بہلا لیا کرتا تھا۔ بچے بھی وقتی طور پر بہل جاتے تھے۔

ایک ایل آئی سی ایجنٹ دن بھر لوگوں کو اچھی قیمت پر زندگی بیچنے کا خواب دکھا کر جب گھر

لوٹتا تو اسے اپنی خود کی زندگی جہنم سے بدتر نظر آتی۔ مہینے کی دو چار پالیسی سے بس اتنا مل جاتا تھا کہ بیوی بچوں کا کسی طرح سے پیٹ پال کر بچوں کو معمولی اسکول میں پڑھایا جا سکے۔ مہینے کے آخر میں اکثر گاڑی آ کر اٹک ہی جاتی جو کبھی ادھار پر تو کبھی بیوی کے چھوٹے موٹے زیور کے سہارے پھر سے آگے گھسٹنے لگتی۔

روز صبح سمیر ایک نئے جوش نئی ہمت اور اس یقین کے ساتھ کام پر نکلتا کہ کسی روز اسے بڑی پالیسی ضرور ملے گی جس سے وہ نیہا کے لئے گڑیا سونو کے لئے جوتا اور بیوی کے لئے ایک ٹاپس لے کر گھر جائے گا۔ لیکن شام تک اس کا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا اور تھکے ہارے قدموں سے گھر میں داخل ہوتا۔ بچے بڑی حسرت سے اس کی طرف دیکھتے۔ چھوٹے چھوٹے بچے باپ کی مجبوری اور حالات کو کیا سمجھ پاتے۔

روز کی طرح آج بھی سمیر جب گھر پہنچا تو جیب خالی تھی۔ بچوں نے دروازہ کھولتے ہی سوال داغ دیا۔ 'پاپا ہمارا سامان لائے آپ!' سمیر نے اپنے مرجھائے ہوئے چہرے پر ایک فرضی مسکراہٹ چپکاتے ہوئے کہا کہ 'مجھے منہ ہاتھ دھو کر بیٹھنے تو دو تب بتاؤں گا۔' کئی دن سے دھوکا کھا رہے بچے آج کچھ بھی سننے کو تیار نہیں تھے۔ چھوٹا بیٹا سونو مچل گیا۔ جب تک آپ میرا جوتا نہیں لائیں گے آپ کو گھر میں نہیں آنے دیں گے۔ نیہا نے کہا 'ارے سونو پاپا کو چائے تو پی لینے دو۔' اندر سے روبینہ کی آواز بھی آئی 'سونو کیا بدتمیزی ہے دن بھر کے تھکے ہارے پاپا گھر آئے ہیں تو ان سے اس طرح سے بات کر رہے ہو۔' آج سونو اپنی فرمائش پوری کرانے پر اڑ گیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے دروازے کو چھیک کر کہہ رہا تھا کہ 'آج پاپا اسی وقت گھر میں آسکیں گے جب میرا جوتا اور نیہا کی گڑیا لے کر آئیں گے۔'

سمیر نے کہا تم لوگ اندر چلو میں نیہا کی گڑیا اور سونو کا جوتا لے کر آ رہا ہوں۔ بچوں سے

وعدہ کر کے سمیر آ تو گیا لیکن دو تین سو کا سامان لانے کے لئے پیسوں کا انتظام کرنا مشکل کام تھا۔ اپنے سارے قریبی دوستوں کے نام یاد کر کے، جن سے پیسے مانگے جا سکتے تھے، وہ آگے بڑھتا گیا۔ لیکن کوئی بھی ایسا یاد نہیں آیا جس کا وہ قرضدار نہ رہا ہو۔ کوئی دکان بھی ایسی نہیں تھی جہاں سے ادھار مل جاتا۔ کھانے پینے کا سامان تو دکاندار ادھار دے دیا کرتے ہیں لیکن جوتا چپل اور کھلونے کوئی ادھار نہیں لیتا۔ یہ سب سامان صاحب حیثیت لوگوں کے ہیں جو نقد خریدے جاتے ہیں۔

سمیر کو گھر سے آئے ہوئے چار گھنٹے ہو چکے تھے دکانیں بھی بند ہو چکی تھیں وہ ٹہلتے ٹہلتے نہ جانے کب اسٹیشن تک آ گیا۔ اس کے ذہن میں بس ایک ہی بات گشت کر رہی تھی کہ گھر اسی وقت جائے گا جب اس کے ہاتھ میں نیہا کی گڑیا اور سونو کا جوتا ہو گا۔

ایک اچھے سمجھدار آدمی کے ذہن کو معصوم بچوں کی معمولی سی فرمائش نے اس طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا کہ دل و دماغ بیکار ہو کر رہ گئے تھے۔ اپنے آپ کو وہ بے مصرف سمجھ رہا تھا۔ ایسی زندگی بھی کس کام کی جس کی ہر سانس سسک سسک کر لی جائے اور ہر تمنا کا گلا گھونٹنا پڑے۔

ہر ضرورت اور ہر خواہش کو پورا کرنے کے لئے پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو اس کے پاس نہیں ہیں۔ لیکن اب وہ کسی بھی طرح ڈھیر سارے پیسے کمائے گا۔ یہی سب سوچتا ہوا بے خیالی کے عالم میں بمبئی جانے والی گاڑی پر سوار ہو گیا۔

نہ ٹکٹ نہ سامان اور نہ ہی کسی جاننے والے کا پتہ۔ بس دیوانوں کی طرح ٹرین کی جنرل بوگی کے ایک کونے میں بیٹھا انجان راستوں پر وہ چلا جا رہا تھا۔ ٹرین میں بیٹھتے وقت اس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اس کے جانے کے بعد اس کا گھر کیسے چلے گا۔ گھر میں جلنے والا چولہا جل بھی پائے گا یا فاقے کی نوبت آ جائے گی۔ جس سونو کے لئے وہ جوتا لینے جا رہا ہے کیا وہ اب چپل بھی پہن سکے گا۔ کیا اس کی نیہا اس کے بغیر مرجھا نہیں جائے گی۔

گاڑی بمبئ پہنچ کر رک گئی تو دوسروں کے ساتھ وہ اتر پڑا۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ راستے میں ٹکٹ نہیں چیک ہوا ورنہ کہیں اور پہنچ گیا ہوتا۔ اجنبی جگہ اور انجان لوگوں کے بیچ وہ بھوکا کھڑا تھا۔ سامنے ایک گردوارے میں لنگر چل رہا تھا۔ تھوڑی دیر کی جھجھک کے بعد وہ دوسروں کے ساتھ پیٹ کی آگ بجھانے چل پڑا۔ کھانا کھا کر ہوش ٹھکانے آئے تو کام کی تلاش شروع ہوئی۔

ایک بلڈنگ کے سامنے کافی بھیڑ دکھائی دی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ دبئ جانے کے لئے مزدوروں کی بھرتی ہو رہی ہے۔ سمیر بھی اسی لائن میں لگ گیا۔ تین گھنٹے کے بعد جب اس کا نمبر آیا تو سامنے بیٹھے ہوئے شخص نے اس سے پیپر مانگے۔ سمیر نے بڑی معصومیت سے پوچھا 'کیسے پیپر؟'' ارے پاسپورٹ وغیرہ اور کیا۔' سامنے والے نے جھنجھلا کر کہا۔ 'وہ تو میرے پاس نہیں ہیں۔'' تو بنا پاسپورٹ کے ہی دبئ چلے جاؤ گے' وہ پھر جھنجھلا گیا۔

'بھائی صاحب مجھے پیسوں کی بہت سخت ضرورت ہے۔ میں کوئی بھی کام کرنے کو تیار ہوں۔ آپ کسی طرح مجھے دبئ بھجوا دیجئے۔' سمیر ہاتھ جوڑ کر گڑ گڑانے لگا۔ بغل میں بیٹھا ہوا دوسرا آدمی جو بہت غور سے سمیر کو دیکھ رہا تھا کہنے لگا اچھا لائن سے ہٹ کر ادھر آ جاؤ۔ سمیر کی صلاحیتوں کو شاید اس نے پرکھ لیا تھا کہ یہ پڑھا لکھا نوجوان قسمت کا مارا ہے اور ایسے لوگ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ایمانداری اور محنت سے کام کرتے ہیں۔

ایک کانسٹرکشن کمپنی میں مزدور بن کر سمیر دبئ پہنچ گیا۔ دن بھر کی ڈیوٹی کے بعد اوور ٹائم کر کے زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانا ہی اس نے زندگی کا مقصد بنا لیا تھا اور یہ ڈھیر سارے پیسے کمانے میں اسے کتنا وقت لگ گیا اسے اس بات کا احساس بھی نہ ہو سکا۔

آج وہ سونو کے لئے جوتا، نیہا کے لئے گڑیا اور روبینہ کے لئے سونے کے تین سیٹ لے کر ہندستان جا رہا تھا۔ یوں تو اس کے سات سوٹ کیسوں میں بیوی بچوں کے لئے تحفوں کی بھرما

رتھی۔ مگر سونو کا جوتا اور نیہا کی گڑیا خرید کر اسے سب سے زیادہ خوشی ملی تھی۔

کب فلائٹ ہندستان پہنچی اور کب مسافر جہاز سے اتر کر باہر چلے گئے سمیر کو پتہ ہی نہ چلا۔ جب ایئر ہوسٹس نے مسکرا کر اس سے کہا کہ سر آپ بھی پلین سے باہر چلیں ہم ہندستان میں ہیں تو وہ چونکا اور Sorry کہہ کر کھڑا ہو گیا۔

کبھی بغیر ٹکٹ بمبئی جانے والا مسافر آج ٹیکسی سے اپنے گھر جا رہا تھا۔ گھر پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے گھر کے سامنے ٹیکسی رکوائی اور بڑی تیزی سے ٹیکسی سے اتر کر گھر کا دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ابھی سونو اور نیہا دروازے پر آئیں گے تو وہ ان سے کہے گا کہ تمہارا جوتا اور نیہا کی گڑیا آ گئی ہے اب تو مجھے اندر آنے دو گے۔

ایک کھردری آواز نے اس سے پوچھا کہ آپ کو کس سے ملنا ہے؟ سمیر کے سامنے ایک موٹا سا آدمی کھڑا تھا۔ 'جی! یہاں سمیر صاحب کا کنبہ رہتا تھا۔' 'کون سمیر وہی جو گھر چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔' سمیر کو موٹے کی اس بات سے سخت تکلیف ہوئی لیکن اسے اپنے بیوی بچوں کا پتہ معلوم کرنا تھا اس لئے صبر کے گھونٹ پیتے ہوئے اس نے کہا 'جی ہاں وہی۔'

'اس کے جانے کے بعد اس کی بیوی نے یہ مکان میرے ہاتھ بیچ دیا۔ اب وہ لوگ دو گلی چھوڑ کر سامنے والی چال میں رہتے ہیں۔' سمیر کے چہرے پر اداسی کے بادل آئے لیکن اس نے انہیں برسنے سے روک دیا۔ 'بھائی صاحب آپ کی بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ ان کے گھر تک پہنچنے میں مدد کر دیں۔ میں سمیر کا دوست ہوں۔ اور اس کے بچوں سے ملنا چاہتا ہوں۔' سمیر نے موٹے سے التجا کی تو اس نے اندر جا کر ایک بچے کو بھیج دیا جس نے سمیر کو اس کے نئے گھر تک پہنچا دیا۔ سمیر نے بچے کو دبئی کی چاکلیٹ کا ایک پیکٹ دے کر دروازے سے ہی رخصت کر دیا۔

ٹیکسی سے سامان اتار کر سمیر نے ٹاٹ کا پردہ پڑے ہوئے دروازے کو کھٹکھٹایا تو ایک مہین

سی آواز آئی ممی دیکھئے کون ہے۔ معمولی سی ساڑی پہنے ایک عورت نے پردہ ہٹا کر باہر جھانکا تو سمیر اپنی خوبصورت سی روبینہ کو فوراً پہچان ہی نہ سکا۔ اندھیرے میں کھڑے سمیر کو وہ بھی نہ پہچان سکی۔ 'کیا اندر آنے کو نہیں کہوگی۔' سمیر کی بھاری آواز کو پہچان کر روبینہ نے جلدی سے پردہ ہٹا دیا۔ 'کیا سمیر آپ!' 'ہاں میں۔' یہ کہہ کر سمیر قریب آگیا۔

روبینہ کے ساتھ گھر میں داخل ہوتے ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ اس کے جانے کے بعد ان لوگوں پر کیا گزری ہے۔ اسے اب نیہا کو پہچاننے میں بھی دقّت ہورہی تھی۔ کیوں کہ اس کی گود میں سمیر کی لائی ہوئی گڑیا سے بڑی گڑیا موجود تھی جو اس بنئے نے اسے دی تھی۔ جس کا دس ہزار روپیہ روبینہ نہیں لوٹا پارہی تھی۔ سولہ سالہ نیہا اس کی تیسری بیوی بن چکی تھی۔ سامنے پلنگ پر بیٹھا ہوا ایک لڑکا اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ جس کے پیر میں اب سمیر کے جوتے بھی چھوٹے پڑ جاتے۔ شاید یہ سونو تھا۔۔۔

اور وہ صاحبِ کتاب ہو گئے

پورے گھر پر ایک سوگ کا عالم تھا۔ شنو میاں کی بے راہ روی کی خبر اب کسی سے چھپی نہیں رہ گئی تھی۔ اماں، ابا، بھائی بہن سب ایک دوسرے سے کچھ اس طرح سے شرمندہ نظر آرہے تھے جیسے شنو میاں کی بربادی میں ان کا ہی ہاتھ ہو یا شنو میاں سے جو جرم سرزد ہو چکا ہے اس کے وہی ذمہ دار ہوں۔

خواجہ صاحب بار بار بیگم صاحبہ سے کہہ رہے تھے مجھے حیرت ہے کہ کہاں چوک ہو گئی۔ میں نے اپنی کاروباری مصروفیات کے باوجود اپنے بچوں کی تربیت میں ذرا سی بھی کوتاہی نہیں کی تھی۔ ہر بچے کی طرح شنو میاں کو بھی اعلیٰ تعلیم دلوائی ان کے کپڑے لتے کا خاص خیال رکھا۔ پھر یہ علت اس نے کیسے پال لی۔ آپ ماں تھیں آپ نے بھی کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ دیر رات میں کہاں سے آتا ہے کیا کرتا رہتا ہے۔ اگر شروع میں ہی پتہ چل گیا ہوتا تو حالات یہاں تک نہ بگڑتے باقی بچوں کی طرح اسے بھی اپنے ساتھ پریس کے کام میں کچھ اس طرح الجھا لیتا کہ صاحب زادے ساری چوکڑی بھول جاتے۔

خواجہ صاحب شہر کے مشہور پبلشر تھے۔ اپنا آفسیٹ پریس، اپنی دکان اور اپنی ایجنسیاں سبھی کچھ ان کے پاس تھا۔ پبلشنگ ان کا آبائی کاروبار تھا۔ تین پشتوں سے یہ کاروبار 'خواجہ اینڈ سنس' کے نام سے چل رہا تھا۔ شہر کے عزت دار رئیسوں میں ان کا شمار تھا۔ تین بیٹوں میں سے دو بیٹے ان کے ساتھ کاروبار میں ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھے۔ سب سے چھوٹے بیٹے شہنواز خواجہ جو شنو میاں کے نام سے پکارے جاتے تھے گھر بھر کے چہیتے تھے اسی لئے کاروبار کی ذمہ داریوں سے ابھی

دور تھے۔ دن بھر کہاں رہتے ہیں رات میں کب آتے ہیں ان سب باتوں پر کبھی کسی کا دھیان ہی نہیں جاتا تھا۔ خواجہ صاحب کا ایک شریف خاندان تھا۔ آج تک کسی نے بھی بے راہ روی اختیار نہیں کی تھی۔ اس لئے کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شنو میاں کی گھر سے غیر حاضری خاندان کی ناک کٹانے کی وجہ بن رہی ہے۔ وہ تو بھلا ہو منشی جی کا جنہوں نے شنو میاں کی بربادی کی خبر خواجہ صاحب کو دے دی ورنہ بات کتنی بگڑ جاتی کسی کو پتہ ہی نہ چل پاتا۔

کل دوپہر میں منشی جی نے خواجہ صاحب سے کہا 'ماشا اللہ شنو میاں نے تو شہر میں دھوم مچا رکھی ہے۔ کیا خوب کہتے ہیں اتنی چھوٹی سی عمر میں اتنی پختہ شاعری بڑے بڑے استادوں کے دانت کھٹے کر دیتے ہیں۔' منشی جی کیا کہتے رہے یہ خواجہ صاحب نہ سن سکے بس ان کے لئے یہی اطلاع بڑی سنسنی خیز اور تکلیف دہ تھی کہ شنو میاں شاعر بن گئے ہیں۔ 'یہ آپ کس کی بات کر رہے ہیں منشی جی! شنو میاں اور شاعری' منشی جی نے اب بھی خواجہ صاحب کے تیوروں کو محسوس نہیں کیا۔ جی ہاں سرکار اپنے شنو میاں۔ اب تو وہ نشستوں کی جان ہیں بڑے بڑے مشاعروں میں بلائے جاتے ہیں۔ ''ہوں''۔ خواجہ صاحب کی لمبی سی ہوں نے منشی جی کو خاموش کر دیا۔

خواجہ صاحب نے جب یہ خبر بد گھر والوں کو سنائی تو پورا گھر سناٹے میں آ گیا۔ شنو میاں نے شاعری کیا شروع کی گھر والوں کے لیے معاذ اللہ شراب کا شوق پال لیا۔ نشستوں اور مشاعروں میں شرکت بھی اسی طرح محسوس کی گئی جیسے کوٹھوں پر جانا شروع کر دیا ہو۔

صاحب زادے جب بھی تشریف لائیں میرے پاس بھیج دیجئے گا۔ بیگم سے یہ کہہ کر خواجہ صاحب اٹھ گئے۔

رات ساڑھے بارہ بجے جب گنگناتے ہوئے شنو میاں گھر میں داخل ہوئے تو سارا گھر ان کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ لیجئے نواب صاحب آ گئے۔ یہ کہہ کر سب سے پہلے بھیا اٹھ کھڑے

ہوئے۔ان کے پیچھے بھائی جان بھی چلے گئے۔جن بہنوں کے شنو میاں بڑے چہیتے تھے آج وہ بھی اس طرح سے گھور رہی تھیں جیسے وہ چوری کر کے آ رہے ہوں۔

سب کی چڑھی ہوئی تیوریاں دیکھنے کے بعد بڑی خوش دلی سے شنو میاں نے امی حضور سے پوچھا کیا بات ہے امی آج سب لوگ کچھ اکھڑے اکھڑے دکھائی دے رہے ہیں۔یہ سب تم اپنے ابا جان سے جا کر پوچھو وہ اپنے کمرے میں تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔امی حضور نے بھی بڑی بے رخی سے جواب دیا۔

شنو میاں جب کمرے میں داخل ہوئے تو خواجہ صاحب بڑی بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔'کیا بات ہے ابو حضور کیسی طبیعت ہے آپ کی۔'شنو میاں نے بڑی خندہ پیشانی سے ابو حضور سے حال دریافت کیا۔'میں تو بالکل ٹھیک ہوں لیکن آپ کو شاید شاعری کا مرض لاحق ہو گیا ہے۔'' آپ تو اس طرح کہہ رہے ہیں جیسے مجھے شاعری نہیں بلکہ کینسر کا مرض ہو گیا ہو۔'شنو میاں نے زندہ دلی برقرار رکھی۔''کینسر تو بس اسی کو لے ڈوبتا ہے جسے ہوتا ہے لیکن آپ جس مرض میں مبتلا ہو گئے ہیں وہ تو پورے گھر کی تباہی کا باعث بن رہا ہے۔''ابو حضور کا لہجہ ابھی تک سخت تھا۔

'آپ کو خوش ہونا چاہئے کہ آپ کا بیٹا ایک کامیاب شاعر ہو گیا ہے۔''مجھے قطعی خوشی نہیں ہوئی۔میں ایک پبلشر ہوں اور صرف دوسروں کی کتابیں چھاپ کر اجرت لیتا ہوں۔جن کی کتابیں چھاپتا ہوں انہیں برباد ہوتے دیکھتا ہوں اب تک میں نے جتنے لوگوں کی کتابیں چھاپی ہیں انہیں سائیکل سے اسکوٹر تک پہنچتے ہوئے نہیں دیکھا جب کہ میرے پاس تین تین گاڑیاں ہیں کوٹھی ہے بینک بیلنس ہے۔

'آپ نے اب تک غیروں کی کتابیں چھاپی ہیں اب میری بھی چھاپ دیجئے۔'شنو میاں نے بڑی لجاجت سے کہا۔خواجہ صاحب بڑے ضبط سے کام لے رہے تھے یکا یک بھڑک اٹھے۔

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' تمہاری کتاب چھاپ کر شہر بھر سے یہ سنو کہ خواجہ شاہد علی کے چھوٹے صاحب زادے ردی کا کاروبار کرنے لگے ہیں۔ اپنی کتاب بیچتے پھر رہے ہیں جس کا کوئی خریدار نہیں ہے۔'' ''میاں صاحب زادے تمہیں کچھ خبر بھی ہے کورے کاغذ کی قیمت چھپے ہوئے کاغذ کی قیمت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ سادا کاغذ گن کر بکتا ہے چھپا ہوا کاغذ تول کر بکتا ہے۔ سادہ کاغذ دکان میں لائن لگا کر خریدنا پڑتا ہے چھپے ہوئے کاغذ کو بیچنے کے لئے ردی فروش کو ڈھونڈنا پڑتا ہے۔''

شنو میاں کی ہمت پر اس لمبی چوڑی تقریر کا ذرا بھی اثر نہ ہوا' آپ میرے باپ ہیں آپ کی کمائی پر میرا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا آپ کے دوسرے بیٹوں کا ہے لہٰذا مجھکو میرا حق کتاب کی شکل میں چاہئے۔ آپ میری ایک ہزار کتابیں چھاپ دیجئے۔' 'عجیب نامعقول آدمی ہو۔ جب مجھے معلوم ہے کہ یہ گھاٹے کا سودا ہے تو میں ایسا سودا کیوں کروں گا۔ تمہاری کتاب بکے گی نہیں مجھے پتہ ہے۔'

'چھپنے سے پہلے کاتب کو پیسہ دوں کاغذ خریدوں چھپائی پر خرچ کروں اس کے بعد بائنڈنگ پر پیسے لٹاؤں تب جا کر تمہاری کتاب سامنے آئے گی۔ یعنی تمہیں صاحب کتاب بنانے کے شوق میں ساری دنیا کو مالا مال کر دوں۔ بات اگر یہیں پر ختم ہو جائے تب بھی ایک بار سوچا جا سکتا ہے۔ ایک ہزار کتابوں کو رکھنے کے لئے گھر کی ایک الماری بھی ضائع کر دوں۔'

'آپ کی ساری دلیلیں اپنی جگہ پر لیکن میری کتاب ''چوکھٹ پر دستک'' ایک اچھے سے گیٹ اپ میں ضرور چھاپ دیں۔' شنو میاں کی یہ خواہش پوری کر دی گئی اور ایک دن ان کی کتاب کا رسم اجراء بھی ہو گیا۔

خواجہ صاحب کے بیٹے کی پہلی کتاب اور خواجہ اینڈ سنس کی پچاس سالہ تاریخ کا پہلا واقعہ۔ جب اس گھرانے کے کسی فرد کی کتاب چھپی اور اس کا رسم اجرا ہوا تو اس موقع پر سارا شہر مدعو

تھا۔ خوب شاندار تقریب ہوئی۔ تقریب کے بعد جب خواجہ صاحب نے شنو میاں سے پوچھا کہ آج کتنی کتابیں بک گئیں اور کتنی کے آرڈر ملے' تو شنو میاں نے بڑی خوشی خوشی بتایا کہ 'ماشاءاللہ سات کتابیں بک گئیں۔' اچھا کہہ کر خواجہ صاحب خاموش ہو گئے۔

اس کے بعد ایک مہینہ گزر جانے کے بعد بھی جب آٹھویں کتاب بکنے کی نوبت نہیں آئی تو خواجہ صاحب نے شنو میاں کے بستر پر ان کتابوں کا ڈھیر رکھوا دیا اور شنو میاں سے کہا اب تم ان کتابوں پر سویا کرو الماری میں مجھے دوسرے ضروری کاغذات رکھنے ہیں۔۔۔

ورجینٹی ٹیسٹ

وہ جب سے کالج میں آئی تھی اس کی دلکش شخصیت نے سب کو موہ لیا تھا۔ وہ جتنی حسین تھی اتنی ہی سنجیدہ بھی تھی۔ آج تک اس کو کسی نے بے مقصد گھومتے پھرتے یا بغیر ضرورت کسی سے بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔ کلاس کے ختم ہونے کے بعد وہ کامن روم یا لائبریری کے علاوہ کبھی لان میں بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

شروع شروع میں بہت سے منچلوں نے اس کے لئے آہیں بھری تھیں لیکن اس کی پروقار شخصیت کو دیکھ کر سب کے سب ٹھنڈے پڑ گئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لڑکوں کے دلوں میں خود بخود اس کی عزت سمانے لگی۔

ساجد نے کبھی بھی اس کے لئے آہیں نہیں بھری تھیں۔ کبھی اس کی طرف کوئی فقرہ نہیں اچھالا تھا۔ اس کے باوجود وہ اپنے اندر مچلنے والے شدید جذبے کو اس سے چھپا بھی نہ سکا تھا۔ اسے اس تلخ حقیقت کا احساس بھی تھا کہ وہ نجمہ کا منگیتر ہے جسے اس نے چاہا نہیں تھا تو ناپسند بھی نہیں کیا تھا۔ لیکن اب اس کو کیا کرتا کہ اس کے دل پر اس حسین سنجیدگی نے ایسا وار کیا تھا کہ بے چارہ گھائل ہو کر رہ گیا تھا۔

دونوں ایک ہی کلاس میں تھے، مضمون بھی ایک ہی تھے۔ اس لئے روز ہی آمنا سامنا ہو جاتا تھا۔ لیکن آج تک وہ اس کے نام کے سوا اس کے بارے میں اور کچھ نہ جان سکا تھا۔ وہ کون ہے، کہاں سے آئی ہے اور کس خاندان سے اس کا تعلق ہے۔

اس خوبصورت قیامت کا نام پروین تھا۔ پروین کی نگاہوں میں جو بیگانگی اور لاتعلقی دوسروں کے لئے تھی ویسی ساجد کے لئے نہیں تھی۔ حالانکہ دونوں میں کبھی بات چیت نہیں ہوئی تھی

ایک دوسرے سے متعارف بھی نہیں ہوئے تھے پھر بھی آنکھوں میں شناسائی کی جھلک موجود تھی اور اسی جھلک نے ساجد کو ٹوٹنے سے بچالیا تھا۔ ساجد کو یہ یقین تھا کہ شناسائی کی یہ جھلک ایک نہ ایک دن محبت کی روشنی بن کر اس کے سارے وجود کو جگمگادے گی۔

ایک دن ساجد کلاس سے نکلا ہی تھا کہ موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ چھتری ہونے کے باوجود وہ کار تک پہنچتے پہنچتے کافی بھیگ گیا تھا۔ بھیگی ہوئی چھتری کار کی پچھلی سیٹ پر ڈال کر اس نے کار آگے بڑھادی۔ تیز بارش میں لوگ جا بجا کسی پناہ گاہ میں رک کر بارش کے رکنے کا انتظار کر رہے تھے۔ سڑک پر بس اکا دکا گاڑیاں ہی گزر رہی تھیں۔ اتنے میں ساجد کی نظر ایک لڑکی پر پڑی جو بہت اطمینان کے ساتھ اس زبردست بارش میں بھیگتی ہوئی اپنا راستہ طے کر رہی تھی۔ وہ اس کے پاس سے گزرا تو اس نے دیکھا کہ وہ پروین ہے اور پھر خود بخود اس کے پاؤں بریک پر چلے گئے۔ جب پروین قریب آئی تو ساجد نے پچھلی سیٹ سے چھتری اٹھائی اور یہ کہتے ہوئے اس کی طرف بڑھادی ''آپ کو کار میں بیٹھنے کو نہیں کہوں گا کیونکہ مجھے یقین ہے کہ آپ اس پیشکش کو قبول نہیں کریں گی اور انکار میں برداشت نہیں کرسکوں گا لیکن یہ چھتری لے لیجئے کبھی واپس کر دیجئے گا''۔

پروین نے آج پہلی بار ساجد کو بہت غور سے دیکھا پھر نظریں جلدی سے نیچی کرلیں۔ ساجد کی نگاہوں کی گرمی نے اس کے بھیگے وجود کو تپا کر رکھ دیا تھا۔ اس نے شکریہ کے ساتھ چھتری قبول کرلی۔ یہ معمولی سا واقعہ دونوں کے لئے یادگار لمحہ بن گیا۔ چھوٹی سی ملاقات دوستی میں بدلی اور دوستی محبت میں۔ دونوں ایک دوسرے کی دھڑکن بن گئے۔

ساجد ایک اعلیٰ خاندان کا لڑکا تھا۔ باپ تعلقے دار تھے۔ بڑے بھائی ڈاکٹر تھے۔ بھائی کی بیوی زیبا بھی ڈاکٹر تھیں۔ خود ساجد سول سرورس کے امتحان میں بیٹھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ماموں کی لڑکی نجمہ سے بچپن میں ہی منگنی ہوگئی تھی۔ ماموں کا گھرانہ کافی آزاد خیال تھا جس کا سب سے زیادہ اثر نجمہ نے قبول کیا تھا۔ وہ دوسرے کالج میں پڑھتی تھی۔ خوبصورت ہونے کے ساتھ بہت زیادہ

فیشن پرست بھی تھی۔ یہ ساری باتیں ساجد نے پروین کو بتا دی تھیں۔ نجمہ کے بارے میں خود اس کی رائے بھی یہی تھی کہ وہ نہایت بے باک اور خود سر لڑکی ہے۔

پروین کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا کر ساجد نے چاہا تھا کہ پروین بھی اپنی پراسرار شخصیت پر سے پردہ اٹھا دے لیکن وہ بڑی بے چارگی سے اس کی طرف دیکھ کر چپ ہو جاتی۔ ساجد جب بہت اصرار کرتا تو وہ کہتی "دیکھو ساجد میں نے تمہیں بہت شدت سے چاہا ہے اور تمہاری بے رخی میں برداشت نہ کر سکوں گی۔ میرے پاس بتانے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ لہٰذا مجھ سے ایسے سوال مت کیا کرو"۔ اس جواب سے ساجد بھی خاموش ہو جاتا اور بات ٹل جاتی۔

ساجد کی اس محبت کی راز دار صرف اس کی بھابھی تھیں۔ ساجد کو انہوں نے کئی بار سمجھایا تھا کہ اب وہ کسی کی امانت ہے اس لئے اسے اس نئے راستے سے پلٹ آنا چاہئے۔ لیکن نہ تو ساجد پلٹ سکا اور نہ ہی اس کی بھابھی ہی اس کی پر زور مخالفت کر سکیں کیوں کی پروین کی خوبصورت شخصیت سے وہ خود بھی بہت متاثر تھیں۔ انہیں اس بات کا اچھی طرح احساس تھا کہ نجمہ کے مقابلہ میں پروین زیادہ بہتر ہے۔ لیکن بات گھر کی تھی اس لئے کھل کر پروین کی حمایت بھی نہیں کر سکتی تھیں۔

ایک دن ساجد نے پروین کو بتایا کہ اس کے گھر والے جلد از جلد نجمہ سے نکاح کر لینے پر زور ڈال رہے ہیں رخصتی بعد میں ہوتی رہے گی کیوں کہ ماموں کی طبیعت بہت خراب رہتی ہے اس لئے وہ اپنی زندگی میں ہی نجمہ کا نکاح کر دینا چاہتے ہیں۔ یہ بات بتا کر ساجد نے پروین سے کہا "اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں"۔

پروین نے بڑی بے بسی سے ساجد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں کیا جواب دوں؟" "تم جو جاننا چاہتے ہو اس کو جان لینے کے بعد مجھ سے دور ہو جاؤ گے اور تم سے دور رہ کر میں زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔

''لیکن پروین اتنا تو سوچو کہ میں اپنے گھر والوں کو تمہارے بارے میں کیا بتاؤں؟'' کیا میں یہ کہوں کہ جس لڑکی سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا کہ وہ کون ہے اور کہاں رہتی ہے؟ اس کے والد کیا کرتے ہیں؟'' کتنی عجیب بات ہے کہ میں تو ایک طے کیے ہوئے رشتہ کو چھوڑ کر تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں لیکن تمہارے بارے میں کچھ بھی پتہ نہیں۔ تمہاری خاموشی سے اب مجھے وحشت ہونے لگی ہے۔ بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تم مجھ سے کھیل رہی ہو۔ شادی کسی اور سے کرنا چاہتی ہو۔''

اتنی بڑی گالی مت دو۔ ساجد میری ہر سانس تمہاری محبت کے لئے وقف ہے۔ میری ہر دھڑکن تمہارے نام کی مالا جپتی ہے۔ ایسی صورت میں کسی اور کے بارے میں کب سوچ سکتی ہوں۔ خیر! آج تم نے اتنی بڑی بات کہی ہے تو سنو کہ میں کون ہوں، کہاں رہتی ہوں اور میرا گھرانہ کیسا ہے۔ اس کو سن لینے کے بعد مجھ سے ملو یا نہ ملو لیکن اتنی مہربانی ضرور کرنا کہ میری باتوں پر یقین کر لینا۔ مجھے جھوٹا مت سمجھنا۔ آج پہلی اور آخری بار میں کسی کو اپنے بارے میں بتانے جا رہی ہوں۔ میں تارا بائی کے کوٹھے پر رہتی ہوں۔ چونکو مت۔ اگر آگے سننے کا حوصلہ رکھتے ہو تو بتاؤں ورنہ یہیں پر بات ختم کر دوں۔''

ساجد نے پروین کے چہرے کی طرف دیکھا جو مجسم سوال بنا اس کو دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ گمبھیر لہجے میں بولا ''مجھے یقین ہے کہ تم جو کچھ کہو گی وہ سچ ہو گا اور میں اس سچ کو ضرور سنوں گا۔''

پروین نے پھر کہنا شروع کیا ''مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں ایک اچھے گھر میں رہتی تھی۔ ہم دو بھائی بہن تھے۔ ممی پاپا تھے۔ میرے پاپا کا نام اعجاز احمد تھا۔ میں چوتھی کلاس میں پڑھتی تھی۔ ایک دن اسکول سے واپس آ رہی تھی کہ راستے میں ایک آدمی نے مجھ سے کہا کہ میرے پاپا کسی حادثہ کا شکار ہو گئے ہیں اور وہ اسپتال میں ہیں۔ میں اس وقت اتنا بدحواس ہو گئی تھی کہ مجھے یہ بھی خیال نہیں آیا کہ میں ایک انجان آدمی کے ساتھ ٹیکسی میں اسپتال کیوں جا رہی ہوں جبکہ مجھے پہلے گھر جانا

چاہئے تھا۔ راستے میں اس نے مجھے ایک رومال سنگھا دیا جسے سونگھتے ہی میں بے ہوش ہوگئی۔ پھر مجھے کچھ یاد نہیں۔ شاید دو دن تک متواتر میں بے ہوش رہی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو تارا بائی کے کوٹھے پر پایا۔

وہاں ہر رات گھنگھروؤں کی آواز میرا مقدر بن گئی۔ کئی دن تک میں روتی رہی وقت گزرتا گیا۔ تارا بائی سمجھاتی کہ میرے باپ کا انتقال ہوگیا ہے اور باپ کے غم میں میری ماں نے میرے بھائی کو مار کر خودکشی کرلی۔ اب اس دنیا میں سوائے تارا بائی کے میرا اور کوئی نہیں ہے۔ اور وہ میری خالہ ہے"

جیسے جیسے میں بڑی ہوتی گئی مجھے معلوم ہوتا گیا کہ تارا بائی ایک نائیکا ہے جو بھولی بھالی لڑکیوں کو خریدتی ہے اور پھر انہیں ناچ گانا سکھا کر ان سے دھندہ کراتی ہے۔

"میں بہت چھوٹی عمر سے ہی اس کے ساتھ ہوں اس لئے اس نے میرے ساتھ یہ رعایت برتی کہ مجھے تعلیم بھی دلواتی رہی۔ لیکن دو سال سے مجھے بھی وہ اس دھندے میں لگانا چاہتی ہے۔ مگر میں اس کو یہ کہہ کر تسلی دیتی رہتی ہوں کہ پڑھنے لکھنے کے بعد میں اس کے لئے اس پیشے سے زیادہ پیسہ کما سکوں گی۔ میں اسی لئے اتنی محنت سے پڑھتی ہوں کہ جلد از جلد پڑھائی مکمل کر کے کوئی اچھی سی سروس کرلوں تاکہ اس گندے پیشے سے چھٹکارا مل سکے۔

اب تم اگر یہ کہو کہ میں تارا بائی کا کوٹھا چھوڑ کر کہیں اور کیوں نہیں رہتی تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہاں جو بھی آتا ہے اس کا مقصد اور نیت دونوں صاف ظاہر ہوتی ہیں اس لئے وہاں اپنے بچاؤ کا امکان زیادہ ہے لیکن تمہاری دنیا میں کسی کی نیت کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بھیڑ کے لباس میں کون کب بھیڑیا بن جائے اس کا اندازہ سب کچھ لٹ جانے کے بعد ہی ہوتا ہے۔"

"ساجد تم نے اتنی باتیں جتنی سنجیدگی سے سنی اور ان پر یقین کیا تو اس پر بھی یقین کرو کہ تمہاری پروین آج بھی پاک ہے۔ ابھی تک کسی مرد کی انگلی کا لمس تک اس نے محسوس نہیں کیا ہے۔"

’’اتنا سن لینے کے بعد ایک بات اور سن لو اسکے بعد جو فیصلہ چاہے کر لینا۔ تمہاری نجمہ کو دوسرا ساجد مل جائے گا، تمہیں دوسری پروین مل جائے گی لیکن پروین کو دوسرا ساجد نہیں مل پائے گا۔‘‘

چند لمحے تک ساجد کچھ سوچتا رہا پھر بولا، ’’تم نے جو کچھ کہا وہ سب سچ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم سورج کی پہلی کرن کی طرح پاک ہو لیکن دنیا کو جس دن معلوم ہوگا کہ تم تارابائی کے کوٹھے پر رہتی ہو تو تمہاری پاکیزگی پر کون یقین کرے گا۔ خاص طور سے میرے گھر والے جو اس بات پر ناراض ہوں گے کہ میں نجمہ کو چھوڑ کر تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’ساجد! اپنی پاکیزگی ثابت کرنے کے لئے میں کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔ تم ایسا کرو کہ اپنی بھابھی سے میرا Verginty Test (کنوارے پن کی جانچ) کرالو۔ وہ ایک ڈاکٹر ہونے کے ساتھ تمہارے گھر کی ایک ذمہ دار فرد بھی ہیں۔ ان کی گواہی کے بعد لوگوں کو میری پاکیزگی کا یقین آ ہی جائے گا۔‘‘

ساجد نے پروین کی طرف دیکھا جو بڑی حسرت سے اس کے فیصلہ کی منتظر تھی۔ اس وقت ساجد کو مریم کی وہ پینٹنگ یاد آ گئی جو اس کے کمرے میں ٹنگی ہوئی تھی۔ اس کو پروین کے چہرے پر حور وں جیسا تقدس اور نور کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے پرعزم لہجے میں پروین سے کہا ’’اب گھر جاؤ کافی دیر ہو چکی ہے۔ مجھے نہ تو اب کسی شہادت کی ضرورت ہے اور نہ ہی کسی کی پرواہ۔ ساجد اب صرف تمہارا ہے۔‘‘

بھابھی کو ساری باتیں صاف صاف بتا کر ساجد نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اس کے بعد کہا کہ ’’آپ سے ایک گزارش ہے کہ نجمہ کو بلا کر سمجھا دیجئے۔ اس کو میرے اس فیصلہ سے دکھ ضرور ہوگا۔ لیکن میری مجبوری اسے بتا دیجئے گا۔‘‘

شام کو بھابھی نے نجمہ کو بلوایا تو اس نے آتے ہی کہا ’’میں خود آپ سے ملنا چاہ رہی تھی۔ آپ میرا ایک کام کر دیجئے۔ کسی طرح ساجد کو سمجھا بجھا کر راضی کر لیجئے کہ وہ مجھ سے منگنی توڑ لے۔

میں اس سے شادی نہیں کر سکتی۔'' بھائی کو یہ سن کر خوشی تو بہت ہوئی کہ ساجد کا راستہ خود بخود صاف ہو گیا۔ پھر بھی انہوں نے سخت لہجے سے پوچھا ''کیوں نہیں کر سکتیں ساجد سے شادی؟'' نجمہ نے بہت اطمینان سے بتایا کہ وہ اپنے کسی دوست احمد سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اگر ساجد راضی ہو بھی گئے تو کیا ماموں جان احمد سے تمہاری شادی کرنے پر راضی ہو جائیں گے؟ بھابھی نے بڑے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ''انہیں راضی ہونا ہی پڑے گا کیوں کہ میں احمد کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔''

نجمہ کے اس بیباک جواب نے بھابھی کے دماغ کو بھک سے اڑا دیا۔ ان کا سر چکرا گیا اور انہیں ہر چیز دھندلی دکھائی دینے لگے۔ سامنے بیٹھی ہوئی نجمہ انہیں ساجد کی سنائی ہوئی پروین کی داستان کی تارا بائی لگنے لگی۔ نجمہ کب اٹھ کر چلی گئی انہیں پتہ ہی نہ لگا۔۔۔

ٹوٹی پلیا

میرے گھر کے پاس سے ایک سڑک گزرتی ہے جس پر ہر وقت گھما گھمی رہا کرتی ہے۔ بے شمار موٹر گاڑیاں ہر وقت اس پر سے آتی اور جاتی رہتی ہیں۔ اسی سڑک پر ایک پلیا ہے جو کبھی اچھی حالت میں رہی ہوگی۔ لیکن اب وہ اتنی خستہ حال ہے کہ کبھی بھی ٹوٹ سکتی ہے۔

ایک دن میں اس پلیا پر سے گزر رہا تھا تو قریب سے اس پلیا کی کمزوری کو دیکھا۔ اسی وقت میرے اندر کا سوشل ورکر جاگا۔ میں نے ایک درخواست لکھی اور کمزور پلیا کی خبر سرکار کو دے دی۔ ایک درخواست سے بھلا سرکار کہاں جاگنے والی ہے۔ سوشل ورکنگ کا نیا نیا شوق تھا ایک دو بار تاکید بھی کی۔ پھر بھی پلیا کی طرف سرکار کا دھیان نہیں گیا۔ میں نے ایک پریس نوٹ بنا کر کئی اخباروں کو چٹھی بھیج دی۔ اخبار میں جب میری چٹھی شائع ہوئی اور ساری دنیا نے اس خبر کو پڑھ لیا کہ کینٹ روڈ کی پلیا کمزور ہے اور کسی وقت بھی کوئی بڑا حادثہ ہوسکتا ہے تو سرکار بھی ذرا سا جاگ گئی۔ پلیا کے پاس ایک بورڈ لگ گیا ''پلیا کمزور ہے مہربانی کر کے دھیرے چلیں''۔ کچھ دن کے بعد جب پلیا کا ایک حصہ ٹوٹ گیا تو اسی جگہ ایک دوسرا بورڈ لگا دیا گیا ''پلیا انتہائی کمزور ہے مہربانی کر کے محتاط ہو کر چلیں''۔ جب میں نے یہ دیکھا کہ سرکار پلیا بنوانے کے بجائے صرف بورڈ بدل بدل کر کام چلا رہی ہے تو میں نے اپنے علاقہ کے ایم پی صاحب سے ملاقات کی اور کہا کہ جناب پچاس ساٹھ ہزار میں یہ پلیا بن جائے گی ذرا اس پر بھی دھیان دے دیجئے۔ ایم پی صاحب کا مزاج پہلے ہی سے کچھ گرم تھا، بہت طیش میں کہنے لگے آپ کے سامنے ایک چھوٹی سی پلیا ہے میرے سامنے پورے ملک کی کمزوری ہے میں پہلے اس پر دھیان دوں گا یا چھوٹی سی پلیا پر۔ میں نے کہا حضور پلیا بھی ملک میں ہی ہے اور اس پر چلنے والے بھی اسی ملک کے پاشندے ہیں۔ اگر اس پلیا پر کوئی حادثہ پیش آ گیا تو

ملک کا ہی نقصان ہوگا۔

آپ تقریر مت کیجئے مجھے معلوم ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ حکومت کے پاس پیسہ نہیں ہے یہ کہہ کر ایم پی صاحب نے بھی اپنا دامن بچالیا۔

ایک دن ایک بدنصیب بس اس پلیا پر سے گزر رہی تھی کہ پلیا ٹوٹ گئی اور بس نالے میں جا گری۔ بس پر نئے دولہا دولہن اور باراتی سوار تھے اس حادثہ میں دولہا دلہن مارے گئے اور باراتی گھر لوٹنے کے بجائے اسپتال بھیجے گئے۔ اس سانحہ کی خبر بڑے پیمانے پر مشتہر ہوئی۔ علاقہ کے ایم پی صاحب نے حکومت کی لاپرواہی پر اسے خوب لتاڑا اور مرنے والوں کے وارثوں کو ایک ایک لاکھ روپئے معاوضہ دلوایا۔

اس حادثے کے بعد پھر سے پلیا کے پاس سرکاری بورڈ لگنے لگے ''پلیا زیر تعمیر ہے تکلیف کے لئے معاف فرمائیں''۔ کچھ دنوں کے بعد ایک اور بورڈ لگ گیا ''کام جاری ہے'' اور ایک دن پلیا بن کر تیار ہوگئی۔ ایم پی صاحب نے اس پلیا کا افتتاح بھی کر دیا۔ پلیا کے بیچ میں ایک بڑا سا پتھر بھی لگا دیا گیا جس پر لکھا تھا ''پلیا کا ادگھاٹن فلانے ایم پی نے کیا''۔ میں یہ ساری حرکتیں دیکھ رہا تھا۔ جب پلیا پر سے بھیڑ ہٹ گئی، ہم اور پلیا اکیلے رہ گئے تو میں نے ایک کوئلہ لیا اور اس پتھر پر لفظ پلیا کاٹ کر اس کی جگہ نئے دولہا دلہن کی سمادھی لکھ دیا۔ اب اس پتھر پر لکھی عبارت کچھ اس طرح تھی ''نئے دولہا دلہن کی سمادھی کا ادگھاٹن فلاں ایم پی نے کیا''۔۔۔

پیاس

عدیل کو دبئی گئے ہوئے ابھی صرف ۱۵ دن ہوئے تھے، لیکن ریحانہ کو ایسا لگ رہا تھا جیسے صدیاں بیت گئیں۔ عدیل کے ساتھ بتائے ہوئے شادی کے چھ مہینے کبھی سمٹ کر ایک ساتھ سامنے آجاتے، کبھی ایک ایک لمحہ یادوں کے نشتر لئے اسے مارتا رہتا۔ ان چھ مہینوں میں عدیل نے اپنی بے پناہ محبت سے اسے شرابور کر رکھا تھا لاکھ سوچنے پر بھی وہ لمحہ تلاش نہ کر پاتی جب عدیل نے اسے کسی بات پر ٹوکا ہو یا محبت کی شدت میں کمی کی ہو۔ عدیل کی زندگی میں ریحانہ سب سے بڑی خوشی بن کر آئی تھی۔ زندگی کے ایک ایک لمحے کو خوشگوار بنانا عدیل کی شخصیت کا خاص پہلو تھا۔ اداسی اور پریشانی جیسے اس کے حصہ میں آئی ہی نہیں تھی یا یوں کہیئے کہ پریشان کن اور فکر مند حالات میں بھی اسے مسکرانے کا فن آتا تھا۔

پڑھا لکھا خوبصورت عدیل دوا کی ایک کمپنی میں سلیس آفیسر تھا۔ اچھی خاصی تنخواہ تھی۔ مگر بڑے شہر میں رہنے کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ پھر دلی جیسے شہر میں عدیل کس طرح ٹھاٹ باٹ سے رہ سکتا تھا۔ لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ اور ریحانہ پھٹے حال تھے یا گھر میں کسی کے اٹھنے بیٹھنے کے لئے میز کرسی وغیرہ نہیں تھی۔ ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ کپڑے بھی دس سے اچھے پہنتے تھے۔ دو کمروں کا چھوٹا سا مکان تھا جس میں بڑے سلیقے سے دونوں رہ رہے تھے۔ بظاہر دونوں پرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ ریحانہ مستقبل سے مطمئن نہ تھی۔ وہ مستقبل کو حال میں ملا کر دیکھتی تھی۔ اس لئے اسے آنے والے کل اور بیت رہے آج کے لئے پیسے کی کمی کا شدت سے احساس تھا۔

ہر لڑکی کی طرح اس نے بھی ایک خوشحال زندگی کا خواب دیکھا تھا۔ نرم گدیلے صوفوں، دلکش پردوں اور خوبصورت قالینوں سے سجا ہوا ڈرائنگ روم، چینی مٹی کے نازک برتنوں سے سجی ہوئی

الماری، لمبی سی سیاہ رنگ کی ڈائنگ ٹیبل، فلمی اسٹائل کا بیڈروم، کام کرتے ہوئے نوکر اور باہر کھڑی ہوئی کار یہ ساری چیزیں وہ اپنے تصوراتی بنگلے میں دیکھا کرتی تھی۔

کئی بار اس نے عدیل سے کہا بھی تھا ہم لوگ تھوڑی اور محنت کر کے کیا اپنی زندگی میں مزید خوشحالی نہیں لا سکتے۔ 'مائی ڈیئر رینی ہماری زندگی میں کمی کس بات کی ہے جو مزید محنت کر کے خوشگوار لمحوں کو ضائع کرنا شروع کر دیں۔ ارے بھائی تمہیں ایک چاہنے والا خوب روشوہر ملا ہے۔ صبح کو اس کے پہلو میں بیٹھ کر ناشتہ کرتی ہو، دن بھر ایک خوشگوار بے چینی سے اس کا انتظار کرتی ہو۔ شام کو اسکوٹر پر بیٹھ کر اس کے ساتھ گھومنے جاتی ہو اور رات میں اس کے ساتھ......'' اچھا بس ٹائم ٹیبل ختم' اس طرح بات ٹل جاتی۔ لیکن ریحانہ کا یہ احساس ختم نہیں ہو پاتا کہ زندگی میں پیار اور محبت کے علاوہ بھی کچھ ضروریات ہیں۔ سماج کی ایک حیثیت ہے۔ اسٹیٹس کی کچھ ویلیوز ہیں۔

عدیل ایک عام سا آدمی ہوتا تو ریحانہ کو اپنی کم مائیگی کا احساس اتنا نہ ہوتا۔ اپنی آرزوؤں اور خوشیوں کو کب کا سلا چکی ہوتی۔ لیکن اس یقین نے کہ عدیل وہ سب کچھ کر سکتا ہے جو وہ چاہتی ہے، اس میں وہ صلاحیتیں ہیں کہ وہ روپے پیسے کے ڈھیر لگا سکتا ہے، ریحانہ کی خواہشوں اور آرزوؤں کو شدید سے شدید تر کر رکھا تھا۔

ریحانہ اور عدیل کے نظریات میں بس اسی ایک جگہ پر ٹکراؤ تھا۔ وہ وقت کی قدر اس طرح کرتا تھا کہ صرف ایک دوسرے میں ڈوب کر جیا جائے۔ اس کی نظر میں جذبات، محبت، جوانی اور نئے پن کی زیادہ اہمیت تھی۔ عدیل کا خیال تھا کہ جس شدت سے ہم آج ایک دوسرے میں کھو کر مزہ لے سکتے ہیں کچھ عرصے کے بعد یہ شدت نہیں رہے گی۔ وقت نکل جانے کے بعد پیسے کی موجودگی بھی پیار و محبت میں گرمی نہیں پیدا کر سکتی ہے۔ اس لئے جو وقت ملے وہ ریحانہ کے پاس گزارا جائے۔

ریحانہ کا کہنا تھا کہ یہی وقت اور یہی عمر پیسہ کمانے کی ہے۔ اس وقت آپ کے پاس جوش ہے لیاقت ہے اور کچھ کر دکھانے کی لگن ہے۔ اس وقت کا استعمال خوب پیسہ کمانے میں کیا جا سکتا

ہے۔ کار، بنگلہ، بینک بیلنس ہو جانے کے بعد ہم لوگ بے فکری کی زندگی گزار سکتے ہیں۔ پاس میں پیسہ رہتا ہے تو بڑا اطمینان رہتا ہے۔ جیب خالی رہے تو پیار محبت میں بھی مزہ نہیں آتا۔'' لیکن محبت کی سچائی اور جذبے کی صداقت کا پتہ خالی جیب ہونے پر ہی ہوتا ہے۔'' ریحانہ جل کر کہہ دیتی کہ کیا آپ کی محبت گھر کے بڑھتے ہوئے خرچ کو پورا کر دے گی، بچوں کی فیس ادا کر دے گی، کرائے کے مکان سے اٹھا کر اپنے گھر میں لے جا سکے گی؟ ریحانہ کو غصے میں آتا دیکھ عدیل اسے اپنی باہوں میں سمیٹ لیتا اور بڑے پیار سے کہتا اب کیا کریں رینی جی اپنی رگوں میں خون کے بجائے محبت ہی دوڑ رہی ہے۔ محبت صرف لوگوں کے دلوں میں ہوتی ہے یہاں تو پورے کا پورا جسم ہی دل بنا ہوا ہے۔ ہم تو آج میں جینے والے آدمی ہیں۔ آج جو خوشی مل رہی ہے اسے سمیٹ لو۔ ایسا نہ ہو کہ کل کی خوشی کے چکر میں آج کی خوشی بھی گنوا دیں اور کل کی خوشی منانا نصیب ہی نہ ہو۔ یہ بات یہیں پر کچھ دیر کے لئے رک جاتی لیکن ریحانہ کے نظریات میں کوئی فرق نہ آتا۔

ریحانہ کے بھائی دبئی میں ایک اچھی پوسٹ پر تھے۔ سال میں ایک بار گھر آتے تھے۔ بیوی اور بچوں کو ساتھ لاتے۔ بڑے بڑے سوٹ کیس کپڑوں اور تحفوں سے بھرے ہوتے۔ زیور سے لدی بھابھی اور قیمتی کپڑوں میں ملبوس بچوں کو دیکھ کر ریحانہ کو ہمیشہ رشک ہوتا۔ اس بار بھیا واپس جانے لگے تو ریحانہ نے عدیل سے پوچھے بغیر اس کا بایوڈاٹا بھیا کو دے دیا۔ اپنے ملک سے زیادہ دبئی میں عدیل کی تعلیم اور قابلیت کی قدر کی گئی۔ ۲۵ ہزار کی نوکری فوراً مل گئی۔ رہنے کو مکان اور انسنٹیو الگ۔ بھیا نے ٹکٹ کے ساتھ پوری تفصیلات بھی بھیج دیں۔

عدیل کو پہلی بار ریحانہ پر غصہ آیا جس میں دکھ بھی شامل تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ریحانہ بغیر اس سے پوچھے یہ انتہائی قدم اٹھائے گی۔ پھر بھی اپنے آپ کو پرسکون رکھتے ہوئے اس نے کہا ''رینی ایک بار مجھ سے پوچھ تو لیتیں''۔ میں آپ سے اس کا ذکر کرتی تو آپ

کبھی راضی نہ ہوتے۔ میں نے سوچا تھا اگر اچھی پیشکش نہیں ہوگی تو آپ کو بتائے بغیر بات ختم کر دونگی۔ لیکن عدیل آپ خود سوچیں کتنی اچھی پیشکش ہے۔ جو تنخواہ آپ کو وہاں مل رہی ہے اتنی اچھی تنخواہ آپ کو یہاں ۱۵ سال بعد بھی نہیں ملے گی۔ انسٹو اور رہائش الگ ہے۔ عدیل انسان کو زندگی میں ایک بار ہی موقع ملتا ہے۔ اس کا اگر فائدہ نہ اٹھایا گیا تو ساری زندگی صرف پچھتانا پڑتا ہے۔ ''ریحی زندگی بہت ہی چھوٹی ہے اور جوانی اس سے بھی کم ہے جس میں خوشی کے لمحات اس سے بھی کم ہیں۔ ابھی تو ہم ایک دوسرے کو جی بھر کے دیکھ بھی نہ سکے ہیں اور تم جدائی کی باتیں کر رہی ہو۔'' صرف دو سال کی بات ہے اور دو سال پلک جھپکتے گزر جائیں گے۔ پھر تو اپنے عیش ہیں۔ جب ہم لوگ پیسے سے مطمئن ہونگے تو یہی خوشیاں دوگنی ہو جائیں گی۔ زندگی کا ہر رنگ بڑا حسین ہوگا۔ ''میرا خیال ہے کہ جب پیسہ زیادہ ہوتا ہے تو لوگ ایک دوسرے کے قریب ہونے کی بجائے دور ہونے لگتے ہیں۔ ہو سکتا ہے خوشیاں زیادہ ہو جاتی ہوں مگر اس میں سچائی کم ہو جاتی ہے۔''

''عدیل حقیقت پسند بنئے حالات کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ جب ضرورت سامنے ہو اور اس کے پورا کرنے کا کوئی ذریعہ نہ ہو تو بڑی سے بڑی خوشی ماند پڑ جاتی ہے۔ ایسا نہیں ہے عدیل کہ آپ کے جانے کے بعد میں بہت سکون سے رہوں گی۔ مجھے بھی بہت دکھ ہوگا لیکن آنے والے اچھے دنوں کے لئے میں وقتی تنہائی برداشت کرلوں گی۔ بس آپ ایک بار میرا کہا مان لیجئے اس کے بعد ہم لوگ ایک دن کے لئے بھی جدا نہ ہونگے۔''

اس طرح عدیل نہ چاہتے ہوئے بھی دبئی چلا گیا۔ اور اب عدیل کی کمی ریحانہ کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ لیکن وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ جیسے جیسے وقت کا مرہم ریحانہ پر لگتا گیا اس کو قرار آتا گیا۔ پھر زندگی ایک معمول پر آگئی عدیل کے بے چین اور شکووں سے بھرپور خط آتے جس کا جواب وہ بڑی تسکین اور سمجھداری کے ساتھ دیتی رہی۔ موٹی موٹی رقموں کے

پیٹروڈالر کے ڈرافٹ کے سلسلے نے کافی حد تک عدیل کی کمی کو پورا کر دیا تھا۔ اب نئی مصروفیت اور نئی پلاننگ کے ساتھ ریحانہ کی زندگی گزرنے لگی۔

خوبصورت سے ڈبل بیڈ کی تمنا بہت دنوں سے اس کے دل میں مچل رہی تھی۔ یوں بھی پرانا بیڈ بہت تکلیف دہ تھا۔ پتلے سے بیڈ پر جب ریحانہ لیٹتی تو جسم کا جوڑ جوڑ دکھنے لگتا۔ آج فوم کے گدے لگے ہوئے سفید رنگ کے بڑے سے بیڈ پر لیٹی تو جسم کی تکلیف واقعی کم ہوگئی۔ لیکن عدیل کے ساتھ پرانے بیڈ پر گزاری راتوں کی یادوں نے اسے بے چین کر دیا۔ وہ جب تکلیف دہ بیڈ کی شکایت کرتی تو وہ اسے باہوں میں لے کر کہتا ''دیکھو ریمی! بیڈ اگر آرام دہ ہوتا تو ہم جلدی سے سو جاتے۔ تکلیف دہ بیڈ کا فائدہ یہ ہے کہ ہم دونوں جاگتے رہتے ہیں اور پیاری پیاری باتوں میں وقت گزرتا رہتا ہے۔ اب رہی بیڈ کے پتلے ہونے کی شکایت تو وہ اور بھی اچھا ہے۔ ہم لوگوں میں اگر کبھی لڑائی بھی ہوئی تو کتنی ہی دور کھسک کر لیٹیں ایک ہی کروٹ میں ایک دوسرے کے قریب آجائیں گے اور پھر سے دوستی ہو جائے گی۔'' آج بڑے سے بیڈ پر کئی کروٹیں لینے کے بعد بھی ریحانہ عدیل کے پاس نہ پہنچ سکی۔

ریحانہ کو کبھی اپنی سال گرہ یاد نہیں رہی۔ آج جب عدیل کے خط کے ساتھ پانچ ہزار کا ڈرافٹ ملا تو اسے یاد آیا کہ آج اس کا برتھ ڈے ہے۔ ''پانچ ہزار کی یہ حقیر سی رقم اپنی ریمی کے سال گرہ کے تحفے کے لئے۔'' اس جملے کو ریحانہ نے کئی بار پڑھا لیکن اسے وہ مزہ نہیں آسکا جو پچھلی بار اس کے سرہانے رکھے چاکلیٹ کے پیکٹ ایک انگوٹھی اور ایک چھوٹی سی پرچی نے دیا تھا جس پر لکھا تھا اپنی ریمی کو سالگرہ مبارک ہو۔ اس کے سو جانے کے بعد نہ جانے کب عدیل نے اس کے دوپٹے میں لپیٹ کر یہ ساری چیزیں اس کے سرہانے رکھ دی تھیں۔ جب وہ صبح اٹھی اور دوپٹہ اٹھایا تو یہ سب چیزیں اسے ملی تھیں۔ اس سرپرائز کو وہ برداشت نہ کر پائی اور بے ساختہ سوتے ہوئے عدیل سے لپٹ گئی۔

عدیل کو دبئی گئے ہوئے ایک سال ہو چکا تھا اور وہ بیچ میں ایک چکر لگانے کو بے قرار تھا۔ اس نے ریحانہ کو لکھا ''یہ ایک سال ایک صدی بن کر میرے اوپر گزرا ہے۔ اپنا ملک، اپنے لوگ، اپنی فضا اور اپنی رینی کو میں ایک منٹ کے لئے بھی نہیں بھلا سکا۔ دن رات اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے بعد بھی میں بے چین رہا ہوں۔ اب کچھ دن ہندستان آکر تمہارے ساتھ گزار لوں پھر تروتازہ ہو کر لوٹ جاؤں گا۔'' ریحانہ نے اس کا جواب کچھ اس طرح دیا۔ ''عدیل! آپ کے ساتھ ساتھ میں بھی تڑپ رہی ہوں۔ یہ ہم لوگوں کے لئے امتحان کی گھڑی ہے۔ اس وقت ہم لوگ ذرا بھی ڈگمگائے تو ساری محنت اور قربانی پر پانی پھر جائے گا۔ آپ سے ملنے کے لئے تو میں بھی بے چین ہوں لیکن آپ کے آنے پر خرچ بھی بہت ہے اور چھٹی کا نقصان بھی ہے۔ صرف دو سال کی تو بات ہے اس چھٹی کو کیش کر لیجئے۔ کسی طرح یہ سال بھی گزر جائے گا تو پھر ملاقات ہی ملاقات ہے۔''

آج ریحانہ کا برسوں پرانا خواب پورا ہوا تھا۔ اس کا اپنا مکان تعمیر ہو گیا تھا۔ چار کمروں کا خوبصورت سا مکان جس میں ایک چھوٹا سا لان بھی تھا۔ پورے مکان کا چکر لگاتے ہوئے ریحانہ کو بے ساختہ عدیل یاد آگیا۔ اس کی ہر بات میں کشش ہوتی تھی۔ محبت کے رنگ بکھرتے تھے۔ ایک بار کچھ مہمانوں کے آجانے پر ریحانہ نے عدیل سے کہا، ''چھوٹے سے مکانوں میں دو آدمی کے بڑھ جانے پر اٹھنا بیٹھنا مشکل ہو جاتا ہے''۔ ''جانے من یہ فائدہ بھی تو ہوتا ہے کہ تم ہر وقت نظر کے سامنے رہتی ہو۔ بڑے مکانوں میں ایک دوسرے کو تلاش کرنا پڑتا ہے۔ رات کس پر کیسی گزری اس کی خبر صبح ملتی ہے''۔

''آپ ایک خوبصورت مکان کی مالکن ہو گئیں۔ واشنگ مشین سے لے کر کوکنگ رینج تک آپ کے پاس آگیا ہے۔ اب ضرورت کی ہر چیز ہماری میڈم کے پاس ہے۔ امید ہے اب قید جدائی سے مجھے رہائی مل جائے گی۔ حسب وعدہ دو سال کی قید با مشقت میں گزار چکا ہوں۔''

عدیل کو اپنے خط کا جواب کچھ اس طرح ملا۔ ''میرے سرتاج! ہر خوشی آپ کے بغیر ادھوری ہے لیکن سماج میں رہنے کے لئے کچھ سچائیوں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ہم لوگوں کے پاس خوبصورت سا بنگلہ ہو گیا ہے۔ اللہ کے فضل سے آج ضرورت کی ہر چیز ہمارے پاس موجود ہے۔ آپ جب واپس آئیں گے تو باعزت دبئی پلٹ کی سند بھی آپ کے ساتھ ہوگی۔ ایسی صورت میں کیا ہم لوگ اسکوٹر سے کسی کے گھر جائیں گے؟ یہاں واپس آکر شاید آپ گاڑی نہ خرید سکیں۔ تھوڑی قربانی اگر اور دے دی جائے تو یہ تمنا بھی پوری ہو سکتی ہے۔ پھر میں ایک کار بھی آپ کے لئے خرید لوں گی۔''

چچماتی ہوئی کار چلاتے ہوئے ریحانہ عدیل کے بارے میں سوچ رہی تھی جو بات تو مزاحیہ انداز میں کرتے تھے لیکن اس میں اٹل سچائی ہوتی تھی۔ وہ جب عدیل کے ساتھ اسکوٹر پر بیٹھتے وقت کہتی ''بڑا فرق ہے کار اور اسکوٹر میں، کتنے آرام سے سفر گزرتا ہے کار میں۔'' تو عدیل پلٹ کر کہتا ''مائی ڈیئر! فاصلے بھی تو پیدا کر دیتی ہے کار۔'' اس وقت آپ کتنا قریب ہیں مجھ سے۔ آپ کا ہاتھ میری کمر میں ہے۔ آپ کا چہرہ میرے کندھے پر ہے۔ آپ کی خوبصورت سانسوں سے محظوظ ہوتا ہوا میں اپنی منزل پر پہنچ جاتا ہوں اور مجھے تھکن کا احساس بھی نہیں ہوتا ہے۔ کار میں آپ مجھ سے کتنا ہی قریب بیٹھیں یہ قربتیں نہیں ہو پائیں گی۔

ایک انسان جو زیادہ سے زیادہ چاہ سکتا تھا وہ سب ریحانہ حاصل کر چکی تھی۔ بظاہر زندگی میں کوئی کمی نہ تھی مگر یہ ساری چیزیں حال کی ضرورتوں کو پورا کر رہی تھیں۔ مستقبل کے لئے اب بھی کچھ نہ تھا۔ کار پٹرول سے چلتی ہے۔ گھر کو آراستہ کرنے کے لئے پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب گھر کا خرچ بھی پہلے سے کئی گنا بڑھ چکا تھا۔ عدیل اب واپس آکر کوئی معمولی نوکری بھی نہیں کر سکتا تھا۔ تھوڑے پیسوں میں گھر بھی نہیں چلنا تھا۔ اس لئے ضروری تھا کہ اپنا کوئی کاروبار ہو اور بزنس کے لئے اچھی خاصی رقم درکار تھی۔ اگر عدیل ایک سال اور دبئی میں رک

جاتا تو مستقبل بھی سنور جاتا۔ ریحانہ نے بڑے سلیقے سے عدیل کو ایک سال اور دبئی میں رک جانے کا مشورہ دیا۔

عدیل کی مصروفیات اور بڑھ گئیں۔ وہ دن رات کام کر کے زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانے میں لگ گیا۔ ریحانہ کو ملنے والے خطوط میں بھی کمی آ گئی۔ پہلے مہینے میں کم از کم چھ خط آتے تھے۔ اب دو تین مہینے میں ایک خط آ جاتا۔ خط میں محبت سے بھرے جملوں کا استعمال بھی کم ہو گیا۔ بڑا واجبی سا خط ہوتا۔ کئی دنوں سے عدیل کے بدلے ہوئے انداز کو ریحانہ محسوس کر رہی تھی۔ اس کو اس بات کا احساس تھا کہ عدیل کو اس بار روک کر اس نے اچھا نہیں کیا۔ عدیل یقیناً اس سے ناراض ہے۔ اب عدیل کی ناراضگی دیکھ کر وہ سوچ رہی تھی کہ اگر وہ اپنی خواہشات کو سمیٹ کر پیسے خرچ کرتی تو اچھے خاصے پیسے جمع ہو گئے ہوتے اور اب عدیل کو مزید نہ رکنا پڑتا۔ مکان تین کمروں کا بھی بن سکتا تھا۔ کار بھی پرانی خریدی جا سکتی تھی یا اسکوٹر سے ہی کام چل جاتا۔ ریحانہ اپنے آپ سے شرمندہ ہو رہی تھی۔ اب وہ سوچنے پر مجبور تھی کہ اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے اس نے عدیل کی محبت قربان کر دی۔

کئی مہینے کے انتظار کے بعد آج ڈاک آئی تھی۔ ریحانہ نے بیتابی سے لفافہ چاک کیا۔ اس میں پانچ لاکھ کا ڈرافٹ تھا۔ اتنی موٹی رقم دیکھ کر اسے بڑی حیرانی ہوئی۔ اس رقم کے ساتھ تو عدیل کو آنا چاہئے تھا؟ ڈرافٹ کے ساتھ عدیل کا خط بھی تھا۔ ریحانہ نے خط کو کئی بار پڑھا اس خیال سے کہ شاید خط کی عبارت بدل جائے لیکن ہر بار عبارت وہی رہی جو عدیل نے لکھی تھی۔ نہ جانے ریحانہ کیوں سوچ رہی تھی کہ شاید وہ خط کو غلط پڑھ رہی ہے۔ عدیل نے لکھا تھا ''ریحانہ! معاف کرنا میں تمہیں اپنی پیاری رینی نہیں لکھ پا رہا ہوں۔ میں بڑا عجیب سا آدمی ہوں۔ جب کسی سے محبت کرتا ہوں تو اس حد تک کرتا ہوں کہ اپنا آپ بھی بھول جاتا ہوں۔ میرے ہر خیال ہر سوچ اور ہر جذبے پر اس کا قبضہ ہوتا ہے۔ اور جب کسی سے بے گانگی اختیار کرتا ہوں تو پوری

سچائی سے دور ہو جاتا ہوں۔ بیچ کا راستہ مجھے پسند نہیں۔ میں نے تمہیں اپنی ہر دھڑکن میں بسایا۔ اپنی ہر سانس تمہارے نام کے ساتھ لی۔ اس کے بعد بھی تمہیں زندگی میں کمی نظر آئی۔ میں نے کبھی باہر جا کر پیسہ کمانا پسند نہیں کیا۔ مگر تم نے ہر آسائش کو ضرورت بنا کر دیکھا اور مجھے مجبور کیا کہ میں ایک اجنبی ملک میں سب سے دور جا کر پیسہ کمانے کی مشین بن جاؤں۔ تمہاری محبت میں سرشار میں نے یہ کڑوا گھونٹ بھی پی لیا۔ جلد سے جلد وطن لوٹنے کے لئے میں رات دن محنت کر کے پیسہ کماتا رہا جسے تم نے بڑی بے دردی سے خرچ کر کے آگے کی ضرورتیں بتا دیں۔ جتنی تمہاری پیسے کی طلب بڑھتی جاتی اتنی مجھے پیسوں سے نفرت ہوتی جاتی۔ پیسہ مجھے اپنا رقیب لگنے لگا۔ پیسہ پا کر مجھے خوشی نہ ہوتی۔ میں ہمیشہ سوچتا کہ یہی پیسہ تو ہے جو مجھے تم سب سے دور کئے ہوئے ہے۔ اب تم بتاؤ ایسے حالات میں واپس آ کر میں کیسے پہلے کی طرح رہ سکوں گا۔ ہر جگہ پیسہ اپنی اہمیت جتائے گا۔ ہر چھوٹی بڑی بات میں پیسے کی موجودگی ہوگی۔''۔ ''تمہیں یاد ہے مجھے تمہاری چوڑیوں کی کھنک اور پائل کی جھنکار کتنی پسند تھی۔ لیکن اب یہ آوازیں بھی میرے کانوں میں رس نہیں گھول سکیں گی۔ ان آوازوں میں مجھے اب سکوں کی کھنک سنائی دے گی۔ پتہ نہیں کیوں یہ احساس ہو رہا ہے کہ میں اب تمہیں گلے لگاؤں گا تو مجھے اپنی رینی کا لمس نہیں ملے گا۔ مجھے یہ محسوس ہوگا کہ میں ایک بڑی سی نوٹوں کی گڈی کو گلے سے لگائے ہوئے ہوں۔ ہو سکتا ہے میں غلط ہوں۔ مگر میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میری طبیعت بڑی عجیب ہے۔ دبئی جیسے ملک میں چار سال گزارنے کے بعد بھی میں خالص ہندستانی رہا۔''۔ ''جو روپے میں نے بھیجے ہیں اس سے اپنے بنگلے کے اوپری حصہ پر مزید چار کمرے تعمیر کرا کر کرائے پر اٹھا دینا۔ امید ہے اس سے اتنا کرایا مل جائے گا جس سے تمہارا خرچ اور گاڑی کا پیٹرول نکل آئے۔ رہی میری بات تو میں جس فرم میں کام کرتا ہوں اس کے مالک کی لڑکی بھی میری طرح سرپھری ہے۔ اسے بھی زیادہ پیسوں سے نفرت ہے۔ باپ کی کروڑوں کی دولت میں اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ میرے ساتھ

ہندستان آکر دو کمروں کے چھوٹے سے مکان میں رہ کر میرے ساتھ اسکوٹر پر گھومنے کے لئے راضی ہے۔"

اب ریحانہ کو یہ یقین ہو گیا کہ اس نے جو کچھ پڑھا وہ سب صحیح ہے تو گھبرا کر لفافہ دور پھینک دیا۔ اسے لگا جیسے وہ ابھی تک ہاتھوں میں انگارے لئے ہوئے تھی۔ خط کا ایک ایک جملہ گھر کی ایک ایک اینٹ بن کر اس پر برس رہا تھا۔ دور پڑا ہوا ایک لاکھ کا ڈرافٹ اس کی آرزوؤں کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا۔۔۔

گرگٹان

ماسٹر بنواری لال جب تک اسکول میں رہے ہر بچے کے لئے نصب العین اور ہر ٹیچر کے لئے ایک معزز شخصیت بنے رہے۔ اسکول میں یا اسکول کے باہر آج تک کسی نے بھی ان کی برائی نہیں کی تھی۔ سچائی، ایمانداری اور ان کی اصول پسندی کی لوگ مثالیں دیا کرتے تھے۔

ماسٹر بنواری لال کی انہیں خوبیوں کی وجہ سے ان کے ایک شاگرد جو سیاست میں بہت اونچے مقام پر پہنچ گیا تھا، انہیں راجیہ سبھا کا ممبر بنا کر دلی لے گیا اور جب بنواری لال جیسے آدمی پارلیمنٹ تک پہنچ گئے تو ان کی سوجھ بوجھ اور ہمہ گیر شخصیت کو صرف ممبر بنا کر رکھنا نہ صرف ان کے ساتھ زیادتی تھی بلکہ عوام کے ساتھ بھی ناانصافی ہوتی۔ لہٰذا بنواری لال جی کو مرکزی وزیر بھی بنا دیا گیا۔

بنواری لال جی کی ایمانداری اور غریبوں سے ہمدردی کے بارے میں پورے ملک کو پتہ تھا اور ہر ایک کے دل میں بنواری لال جی کی جو عظمت تھی اتنی کسی دوسرے رہنما کی نہیں تھی۔ بنواری لال جی نے بہت ساری برائیوں سے معاشرے کو پاک کرنے کا بیڑا اٹھا رکھا تھا۔ جہیز لینے اور دینے کے خلاف چھیڑی گئی مہم بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ بنواری لال جی ایسی کسی شادی میں شریک نہیں ہوتے تھے جہاں انہیں خبر لگ جاتی کہ جہیز کا لین دین ہوا ہے۔

آج بنواری لال جی کی اکلوتی لڑکی کی شادی تھی۔ سارا شہر اُمڈ پڑا تھا۔ بنواری لال جی نے اپنی اکلوتی اولاد کی شادی میں بھی سادگی باقی رکھی تھی۔ کسی بھی طرح کے کھانے پینے کا انتظام نہیں تھا۔ یہاں تک کہ کسی کے سامنے ایک پیالی چائے تک پیش نہ کی گئی۔ بس ایک بڑی سی کشتی میں الائچیاں رکھی ہوئی تھیں۔ لوگ آرہے تھے بنواری لال جی کو بیٹی کی شادی پر مبارکباد دے رہے

تھے اور بنواری لال جی الائچی کی کشتی کی طرف اشارہ کر دیتے تھے۔ ہر آدمی بڑے ہی احترام کے ساتھ ایک عدد الائچی کچھ اس طرح اٹھالیتا جیسے جنت سے اللہ نے منوسلوا اتارا ہے۔ شادی کی رسمیں ختم ہوئیں اور لڑکی کی رخصتی کا وقت آ گیا۔ سب کی بے چین نگاہیں بنواری لال جی کی طرف لگی ہوئی تھیں کہ بدائی کے وقت وہ اپنے داماد کو تحفہ میں کیا دیتے ہیں۔

لڑکا آئی اے ایس افسر تھا۔ جب اپنی کار میں بیٹھنے لگا تو بنواری لال جی کا نوکر ایک کشتی لے کر آیا جو لال رنگ کے مخمل سے ڈھکی ہوئی تھی۔ بنواری لال جی نے مخمل ہٹایا تو لوگوں نے دیکھا کہ کشتی میں دو عدد سونے کی کنجیاں رکھی ہیں۔ بنواری لال جی نے دونوں کنجیاں داماد کو دیتے ہوئے کہا ''بیٹا! شگون کے طور پر دونوں کنجیاں لیتے جاؤ، دلہن کے ساتھ خالی ہاتھ نہیں جاتے''۔

دولہا دلہن کے ساتھ صرف دو عدد چابیاں لے کر چلا گیا۔ مہمان بھی یک بعد دیگرے رخصت ہو گئے۔ ایک دو دن تک یہ بات لوگوں میں گشت کرتی رہی کہ بنواری لال جی نے اپنے داماد کو کیسی چابیاں دی تھیں۔ اس پر لوگوں نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ ''ایک چابی ایمانداری کی تھی اور دوسری غریبوں سے ہمدردی کی'' اور یہ دونوں باتیں بنواری لال جی نے اگلی نسل کو سونپ دیں۔

پندرہ دن بعد ایک اخبار کے کھوجی نامہ نگار نے تصویر کے ساتھ ایک کہانی شائع کی جس میں لکھا تھا کہ ''بنواری لال جی نے اپنے داماد کو جو دو کنجیاں دی تھیں اس میں سے ایک چابی ایک غیر ملکی کار کی تھی اور دوسری پہاڑی پر بنے پوری طرح آراستہ ایک بڑے سے بنگلہ کی تھی جس میں دنیا کی تمام آسائشیں موجود تھیں''۔۔۔

باسی روٹی

ہر ماں باپ کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ بیٹے کی دلہن خوبصورت لائی جائے۔ یہاں تو لڈن میاں کی دلہن کا معاملہ تھا۔ گھر کے اکیلے چشم و چراغ، ماں باپ کی آنکھوں کا تارا۔ بھلا ان کی دلہن معمولی کیسے ہوسکتی تھی۔ بڑی جستجو کے بعد چاندنی بیگم کے نام کی لاٹری نکلی تھی۔ بڑی دھوم دھام سے بارات گئی اور چاندنی بیگم لڈن میاں کی دلہن بن کر یاسمین منزل میں آگئیں اور ساتھ میں ایک ٹرک جہیز بھی لیتی آئیں۔ دلہن خوبصورت ہو اور جہیز کا ٹرک لے کر آئے اس سے زیادہ دنیا کو اور کیا چاہئے۔

چاندنی بیگم کے حسن و اخلاق کے چرچے دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ کوئی ایسا عزیز نہ تھا جو چاندنی بیگم کے گن نہ گاتا ہو۔ لڈن میاں کی اماں جان ایسی خوبصورت بہو لاکر پھولی نہیں سمارہی تھیں۔ ہر دو گھنٹہ کے بعد مٹھی بھر مرچہ چاندنی بیگم کے اوپر اتارا کرتی تھیں۔ جب کوئی ان کی بہو کی تعریف کرتا تو اماں جان یہی کہتیں کہ اللہ پاک کو میری کوئی نیکی پسند آگئی جس کے بدلے میں چاندنی بیگم میرے گھر بہو بن کر آئیں ہیں۔

لڈن میاں کی شادی کا پہلا سال گزر گیا چاندنی بیگم نے کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا لیکن جب دوسرا سال بھی گزرنے لگا اور چاندنی بیگم نے املی، کمرخ اور کیتھا خریدنا شروع نہیں کیا تو اماں جان کو فکر ہونے لگی۔ اللہ رکھے اب تک تو دلہن کی گود ہری ہو جانی چاہئے تھی لیکن یہاں تو دلہا دلہن ابھی تک قلانچے ہی بھر رہے ہیں۔

اماں جان نے فوراً لڈن میاں کو اپنے نماز کے کمرے میں طلب کرلیا۔ بھئی کیا معاملہ ہے؟ ابھی تک تم لوگ ہنسی ٹھٹھا ہی کرتے رہو گے یا اس گھر کے لئے بھی کچھ سوچو گے۔ اماں جان بغیر کسی تمہید کے شروع ہوگئیں۔ اماں جان مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی کیا؟ میں گھر کا تو پورا خیال رکھتا

ہوں۔لڈن میاں کی زبان لڑکھڑانے لگی۔میرا مطلب یہ ہے کہ اس گھر میں کوئی چراغ جلانے والا پیدا ہوگا یا نہیں؟ جا کر دلہن کو کسی ڈاکٹر کو دکھاؤ۔لڈن میاں نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔امی جان ابھی شادی ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔آپ بلا وجہ پریشان ہیں۔کیوں نہ پریشان ہوں؟ دو سال میں کلو دھوبی کے یہاں دو بچے پیدا ہو گئے ،اپنی جمادارن کی گود بھی سال بھر میں بھر گئی تھی۔ اس وقت امی جان کو یہی دو مثالیں دکھائی دیں جبکہ چند دن پہلے تک چاندنی بیگم کا مقابلہ کسی شہزادی یا پری سے کیا جاتا تھا۔ٹھیک ہے آپ کہتی ہیں تو کسی ڈاکٹر کو دکھا دیں گے یہ کہہ کر لڈن میاں نے اماں جان سے پیچھا چھڑا لیا۔وقت گزرتا گیا لیکن چاندی بیگم کی گود سونی کی سونی ہی رہی۔سارے ڈاکٹر اور حکیم یہی کہتے تھے کہ سب کچھ درست ہے بس اللہ کی مرضی ہے۔ادھر اماں جان کو چاندنی بیگم سے روز کوئی نہ کوئی شکایت رہنے لگی۔وہی بہو جو چند دن پہلے ہیرا لگتی تھی اب پتھر ہو گئی تھی۔

چاندنی بیگم نے اماں جان کو ہر سکھ دیا لیکن ایک بچہ نہ دے کر ایسا جرم کیا تھا جو قابل معافی نہ تھا۔اب لڈن میاں سے اٹھتے بیٹھتے وہ یہی کہتیں اس گھر میں چراغ جلانے والے کی بہت ضرورت ہے اور اس کا انتظام تم کو ہی کرنا ہے۔اب لڈن میاں کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اماں جان کی خواہش ہے کہ میں دوسری شادی کر کے ایک وارث دے دوں۔لیکن چاندنی بیگم سے انہیں کبھی بھی کوئی شکایت نہیں رہی اس لئے اتنی بڑی بات کیسے سوچ سکتے تھے۔جب اماں جان کا اصرار بڑھتا گیا تو لڈن میاں کے دل میں بھی ذائقہ بدلنے کی خواہش بے دار ہونے لگی۔جس نے ہوش سنبھالتے ہی مرغ مسلم کھانا شروع کر دیا ہو اسے دال چاول میں وہ لذت ملتی ہے جو مرغ اور بریانی میں کہاں۔

لڈن میاں کا دل پڑوس کی ایک بیوہ پر آ گیا۔اب صورت شکل اور عمر دیکھنی نہیں تھی صرف گھر میں اجالا لانے کی بات تھی اور بیوہ کے پاس تین سال کی بچی کی شکل میں ایک سرٹیفکیٹ موجود تھا۔کسی بیوہ کی سرپرستی کرنا اور یتیم کے سر پر ہاتھ رکھنے میں جو ثواب ہے بھلا وہ دوسری عبادتوں میں

کہاں۔اب زیادہ سے زیادہ ثواب بٹورنے کے شوق میں لڈن میاں صبح شام پڑوس میں جانے لگے۔اماں جان کا بس ایک ہی نعرہ رہ گیا تھا 'شادی رچاؤ وارث بلاؤ' اس لئے انہوں نے بھی اس بات پر غور کرنا بند کر دیا کہ لڈن میاں کہاں جاتے ہیں اور کتنی دیر تک بیٹھتے ہیں۔اماں جان کو اب چاندنی بیگم کے علاوہ ہر عورت اچھی لگنے لگی تھی۔ساری فضا لڈن میاں کے حق میں تھی بس چاندنی بیگم کا مسئلہ تھا جو ہر صورت میں ان کے چوکھٹ پر بندھی رہنا چاہتی تھیں اور ان کی موجودگی میں کسی دوسری عورت کو ان کے کمرے میں دلہن بنا کر لے آنا آسان کام نہیں تھا۔

لڈن میاں دو دن سے دفتر کے کام سے باہر تھے، جب چاندنی بیگم کو پڑوس کے فون پر چچا کی حالت کی خرابی کی خبر ملی۔باپ کی طرح چاہنے والا چچا بستر مرگ پر ہو اور وہ آخری دیدار نہ کر سکیں یہ کیسے ہو سکتا تھا۔فوراً تیار ہو کر وہ لکھنؤ کے لئے روانہ ہو گئیں۔

شام کو آٹھ بجے جب وہ اپنے گھر پہنچیں تو سب سے پہلے چچا جان سے ہی ملاقات ہوئی جو اپنے بیٹھک میں دوستوں سے باتیں کرنے میں مصروف تھے۔چاندنی کو دیکھتے ہی لہک کر اٹھے، یہ بے موسم برسات کیسے آ گئی۔یہ کہتے ہوئے انہوں نے چاندنی بیگم کو گلے لگا لیا۔لڈن میاں ساتھ میں نہیں آئے؟ ادھر چاندنی بیگم کو چچا کی حالت کی خرابی کے فون میں سازش کی بو نظر آئی اور انہوں نے چچا جان سے معافی مانگتے ہوئے کہا عموں تفصیل پھر بتاؤں گی اس وقت میرا واپس جانا بہت ضروری ہے۔جس رکشہ سے وہ آئیں تھیں اسی کو واپس اسٹیشن چلنے کو کہہ کر جلدی سے بیٹھ گئیں۔

لڈن میاں جو دو دن سے اپنے دوست کے یہاں آرام کر رہے تھے بیگم کو بس میں سوار ہوتے دیکھ کر فوراً گھر واپس آ گئے۔کچھ قریبی دوستوں کو ساتھ لیا، ایک عدد ریڈی میڈ مولوی کو پکڑا اور دلہا بن کر پڑوس میں پہنچ گئے۔چٹ منگنی اور پٹ بیاہ ہو گیا۔

جس طرح عورتیں رات کی باسی روٹی صبح کو تل کر ناشتے میں استعمال کرا دیتی ہیں ٹھیک اسی طرح زبیدہ بیگم کو ان کی بہنوں نے لیپ پوت کر نئی نویلی دلہن بنانے کی کوشش کی تھی۔تین سال

بعد ایک بار پھر لڈن میاں کا کمرہ شب عروسی کے لئے سجایا گیا تھا۔ چونکہ دوسری شادی میں جہیز کی شکل میں لڈن میاں کو صرف ایک عدد بچی ملی تھی اس لئے چاندنی بیگم کی مسہری ہی دلہا دلہن کے کام آرہی تھی۔ لڈن میاں نے جب نائٹ بلب جلا کر زبیدہ بیگم کے قریب ہونے کی کوشش کی تو دروازے پر دھپ دھپ کی آواز آئی۔ زبیدہ بیگم نے چونک کر کہا دیکھئے دروازے پر کوئی ہے۔ لڈن میاں اماں جان کی خواہش پوری کرنے کے لئے اتنے بے تاب تھے کہ انہیں یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ کوئی دروازہ پیٹ رہا ہے۔ ''زبیدہ یہ میرے دل کی دھڑکن ہے جو تمہیں دلہن کے لباس میں دیکھ کر بے قابو ہوئی جا رہی ہے''۔ اس سے پہلے کہ زبیدہ جواب دیتی دروازے کی چٹخنی ٹوٹی اور وہ پاٹو پاٹ کھل گیا۔ چاندنی بیگم آندھی طوفان کی مانند کمرے میں داخل ہوئیں۔ ''میری زندگی میں یہ کبھی نہیں ہوسکتا، اس بستر کو میرے علاوہ دوسرا کوئی نہیں استعمال کرسکتا'' یہ کہتے ہوئے انہوں نے اتنی زور سے مسہری کی چادر کو جھٹکا دیا کہ ایک طرف زبیدہ خانم گریں تو دوسری طرف لڈن میاں۔ لڈن میاں کا نیا کرتا چاندنی بیگم نے تار تار کر دیا۔ رات کے تین بجے تھے لیکن اس ہنگامے کو سن کر گھر کے علاوہ پاس پڑوس والے بھی جاگ گئے۔ کچھ لوگ چاندنی بیگم کی حمایت میں کھڑے ہوگئے تو کچھ لوگوں کو لڈن میاں سے بھی ہمدردی رہی۔ مسئلہ انتہائی سنگین تھا۔ ایک طرف، ایک عورت جو تازی تازی دلہن بن کر آئی تھی، اس کا مستقبل تھا تو دوسری طرف جو تین سال سے رہ رہی تھی اس کے مستقبل کی بات تھی۔ اسی وقت گھر کے بڑے بزرگ بیٹھے اور یہ طے کیا کہ اب لڈن میاں نے شادی کر ہی لی ہے اور اسلامی قوانین کے حساب سے کوئی ناجائز کام نہیں کیا ہے تو زبیدہ بیگم کو بھی ان کا حق ملنا چاہئے لیکن چاندنی بیگم کی بھی حق تلفی نہیں ہونی چاہئے۔ زبیدہ بیگم کو حق دلانے کے لئے اماں جان نے اپنا کمرہ خالی کر دیا اور خود دالان میں مقیم ہوگئیں۔

گھر کی فضا بظاہر پرسکون ہوگئی۔ لڈن میاں کی ساری دلچسپیاں زبیدہ خانم تک محدود ہو کر رہ گئیں اور چاندنی بیگم اکیلی پڑ گئیں۔ ان کے چہرے پر بس اسی وقت مسکراہٹ آتی جب لڈن

میاں کے خالہ کے لڑکے خالد کبھی اس گھر میں آجاتے۔ بس ایک خالد کی ذات ایسی تھی جنہوں نے ہمیشہ چاندنی بیگم کی حمایت کی تھی۔

ایک دن اچانک اس گھر میں ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ زبیدہ خانم کی شادی کو بھی ایک سال ہونے کو آیا لیکن انکی گود بھی سونی رہی جبکہ چاندنی بیگم نے ایک خوبصورت سے بیٹے کو جنم دے دیا۔ چاندنی بیگم بیٹے کی ماں کیا بنی چھنی ہوئی ریاست پھر سے حاصل ہو گئی۔ جہاں اماں جان کی ساری محبتیں اور عنایتیں پھر سے چاندنی بیگم کو حاصل ہو گئیں وہیں بیٹے کی شکل دیکھ کر لڈن میاں نے اس گھر میں خالد کے آنے جانے پر پابندی عائد کر دی کیوں کہ چاندنی بیگم کے بیٹے کی شکل خالد سے بہت ملتی تھی۔۔۔

اس نے مجھے جیت لیا

شہر کی فضا کئی دنوں سے خراب چل رہی تھی۔ فساد کی آگ کسی بھی وقت بھڑک سکتی تھی۔ بس بارود میں ایک چنگاری کی ضرورت تھی۔ شہر کے امن پسند لوگ اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ کسی بھی طرح شہر کا سکون غارت نہ ہونے پائے۔ لیکن کچھ لوگوں کا روزگار دنگے کرانا ہی تھا۔ ان کی روزی کا دارومدار لوٹ، آگ زنی، معصوم لڑکیوں کا اغوا اور قتل و غارت گری پر تھا۔ ایسے لوگوں کی وہ لوگ سر پرستی بھی کرتے تھے جن کے آگے قانون سر جھکائے کھڑا رہتا ہے۔

جب فضا کو بارودی بنانے پر کوئی قدم نہ اٹھ سکا تو اس میں چنگاری ڈالنے والے ہاتھوں کو کون روک سکتا تھا۔ بیچ بازار میں چند منچلوں نے ایک لڑکی کی عزت پر ہاتھ ڈال دیا۔ کچھ لوگ اس گھٹیا حرکت پر ان سے بھڑ گئے اور ہاتھا پائی شروع ہوگئی۔ لڑکی کی عزت بچاتے ہوئے ایک معصوم آدمی اپنی جان گنواں بیٹھا۔ بس اب کیا تھا دنگے کا بگل بج چکا تھا تھوڑی ہی دیر میں اپنے اپنے دشمنوں سے بدلہ لینے کا موسم شروع ہوگیا۔ دکانیں لٹنے لگیں، آگ کے شعلے بلند ہونے لگے۔ ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ پولس کی گاڑیاں اعلان کرنے لگیں کہ آدھے گھنٹے کے اندر آپ لوگ اپنے گھروں میں پہنچ جائیں کرفیو لگا دیا گیا ہے۔ صرف آدھے گھنٹے کا وقت ہے اس کے بعد ایک آدمی بھی سڑک پر دکھائی دیا تو اسے گولی ماردی جائے گی۔

بھاگنے والوں کی بھیڑ میں راگنی بھی تھی جو ٹیوشن پڑھا کر پیدل اپنے گھر کی طرف جارہی تھی۔ جس راستے کو وہ روزانہ پیدل ایک گھنٹہ میں طے کرتی تھی آج اسے صرف آدھے گھنٹے میں

طے کرنا تھا۔ بہت تیز چلنے کے باوجود آدھے گھنٹے کے بعد بھی وہ اپنے گھر سے بہت دور تھی۔ چاروں طرف سناٹا چھا گیا تھا۔ جلتی ہوئی دکانوں کے شعلے دور سے دکھائی دے رہے تھے۔ پولس کی گاڑیوں کے سائرن کی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ پولس چوکیوں کے لاؤڈ سپیکر چیخ چیخ کر یہ بتا رہے تھے کہ کرفیو نافذ کر دیا گیا ہے آپ لوگ گھروں میں بند ہو جائیں۔ اب راگنی کے پاس دو ہی راستے تھے۔ یا تو سامنے سے آنے والی پولس کی گاڑی سے مدد مانگے یا کسی مکان میں گھس کر پناہ لے لے۔ اپنے گھر پہنچ پانا اب ممکن نہ تھا۔ دنگے فساد کے ماحول میں وہ پولس کے رول کو بخوبی جانتی تھی۔ ایسے افسر کم ہی ہوتے ہیں جو کسی کی مدد کریں وہ بھی کسی لڑکی کی۔ زیادہ تر ایسے ہی ہوتے ہیں جو موقع کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اجنبی گھر میں پناہ لینے میں بھی خطرہ تھا نہ جانے مکین کیسے ہوں۔ یہ بھی پتہ نہیں کتنے دنوں تک کرفیو کی وجہ سے کسی کے گھر میں قید رہنا پڑے۔ جو بھی ہو عزت بچانے کے لئے کسی نہ کسی کے گھر میں پناہ لینا ہی ہے اور وہاں خطرہ محسوس کرتے ہی وہ آسانی سے خودکشی بھی کر سکتی ہے۔ اگر پولس کے چنگل میں پھنس گئی تو وہ اسے خودکشی بھی نہیں کرنے دیں گے۔ یہی سوچ کر راگنی نے سامنے والے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ اندھیرے کمرے کی ایک کھڑکی کھلی کسی نے دروازہ کھٹکھٹانے والے کو دیکھا اور پھر دروازہ کھل گیا۔ وہ کمرے کے اندر آ گئی دروازہ پھر بند کر دیا گیا اور کمرے کا بلب بھی جلا دیا گیا۔ راگنی نے جب کمرے کو بغور دیکھا تو پتہ چلا کہ جسے وہ گھر سمجھ کر آئی تھی وہ صرف ایک کمرہ ہے۔ کمرے کے اندر کھڑے ہوئے لڑکے پر نظر پڑی تو اسے ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے جسم سے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لیا ہو۔ وہ برسوں کی بیمار لگنے لگی۔

یہ کمرہ سنیل کا تھا۔ سنیل کالج کا سب سے لوفر لڑکا سمجھا جاتا تھا۔ ہر لڑکی کو چھیڑنا اس کا فرض تھا۔ خاص طور پر راگنی کے تو وہ پیچھے ہی پڑا رہتا تھا۔ آتے جاتے اس پر کچھ نہ کچھ فقرہ ضرور کستا تھا۔ جہاں دوسری لڑکیاں اس طرح کی چھیڑ چھاڑ کا مزہ بھی لے لیتی تھیں وہیں راگنی خاموشی سے سر جھکائے گزر جایا کرتی تھیں۔

ایک ایسی لڑکی جس کے نحیف کندھوں پر بیوہ ماں اور چار چھوٹے بھائی بہنوں کا پیٹ پالنے کی ذمہ داری ہو اور جس ذمہ داری کو وہ ٹیوشن پڑھا کر پورا کرتی ہو اسکے لئے تعلیم حاصل کرنا ہی کسی عیاشی سے کم نہ تھا وہ کسی لڑکے کی چھیڑ چھاڑ میں کیا مزہ لیتی۔ راگنی نے کبھی آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر یہ جاننے کی بھی کوشش نہیں کی تھی کہ بھگوان نے اسے غریبی کے دلدل میں پھینکنے سے پہلے حسن کی بے پناہ دولت سے مالا مال کیا تھا۔ اسے تو بس ایک ہی دھن تھی کسی طرح اس کا بی اے مکمل ہو جائے اور وہ کوئی اچھی سی نوکری حاصل کر کے ڈھنگ سے اپنا گھر چلا سکے۔ شادی بیاہ پیار محبت یہ سب باتیں اس کے لئے ایک ایسا خواب تھیں جسے کبھی اس نے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔

آج پہلی بار ایک ایسی جگہ آ کر کھڑی ہو گئی تھی جہاں اسے یہ سوچنا تھا کہ اگر سنیل اس کی عزت پر ہاتھ ڈالتا ہے تو عزت بچانے کے لئے وہ خودکشی کر کے اپنے بھائی بہنوں اور بیوہ ماں کو بھیک مانگنے پر مجبور کرے گی یا چپ چاپ گھر والوں کی خاطر اپنے وجود کو سنیل کے حوالے کر کے ایک داغدار زندگی گزارے گی۔

''سامنے کرسی رکھی ہے آرام سے بیٹھ جاؤ'' سنیل نے اس کی سوچوں کے دھاگے کو توڑ دیا۔ راگنی نے پہلی بار اسے غور سے دیکھا اور یہ طے کیا کہ وہ اس پر یہ ظاہر نہیں کرے گی کہ وہ ڈر رہی ہے۔ شکریہ کہہ کر وہ بیٹھ گئی۔

سامنے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے سنیل نے کہا: 'دیکھو ابھی تو کرفیو لگا ہے اور نہ جانے کتنے دنوں تک لگا رہے گا اس لئے تمہیں ہی یہ طے کرنا ہے کہ میرے ساتھ اس کمرے میں رہنا ہے یا باہر نکل کر اپنے آپ کو اندھیرے راستوں میں گم کر دینا ہے۔ اگر میرے ساتھ رہنا ہے تو آرام سے بیٹھ جاؤ۔ سامنے باتھ روم ہے منہ ہاتھ دھو لو۔ ادھر چھوٹا سا کچن ہے کچھ کھانا چاہو تو کھا لو'

راگنی کو سنیل کے اس نارمل انداز پر حیرت تو بہت ہوئی لیکن اس نے اتنا ہی کہا کہ ''میں

ٹھیک ہوں مجھے بھوک نہیں ہے''۔ وہ سوچنے لگی کہ سنیل کا یہ انداز شاید اس لئے ہے کہ اسے معلوم ہے کہ اس کمرے میں مجھے رات بھی گزارنی ہے۔ سنیل نے دو کپ چائے بنائی بریڈ پر بٹر لگایا اور راگنی کے سامنے رکھ کر خود چائے پینے لگا۔ ''پی لو، چائے، مجھے اگر پہلے سے معلوم ہوتا کہ آج تم میری مہمان بننے والی ہو تو اچھا انتظام کرتا''۔

سنیل کی اس بات سے راگنی کا بڑھا ہوا ہاتھ رک گیا۔ راگنی کو ہاتھ کھینچتے دیکھ کر سنیل ہنسنے لگا۔ ''دیکھو اس کمرے میں صرف ہم دونوں ہیں تو کچھ نہ کچھ تو بات کرنی ہی ہے، ٹھنڈی ہو جائے گی چائے تو پھر سے بنانی پڑے گی لے لو۔'' راگنی خاموشی سے چائے پینے لگی۔ ''بریڈ بھی کھا لو یہاں یہی انگریزی کھانا ملے گا، کرفیو کے زمانے میں بریڈ بٹر ہی ملتا ہے ایڈمنسٹریشن مرغ مچھلی نہیں مہیا کراتا۔''

راگنی کی سوچ پھر وہیں پر آ کر رک گئی۔ اب اس مہربانی کی قیمت مانگنے والا ہوگا۔

''میں کرسی پر سو جاؤں گا تم میرے بستر پر لیٹ جانا'' سنیل نے پھر اسے چونکا دیا۔ ''کیا کہا؟ میں تمہارے بستر پر لیٹوں گی۔'' ''نہیں تو کیا زمین پر لیٹو گی، یہاں ایک ہی بستر ہے اور میں اتنا بداخلاق نہیں ہوں کہ خود بستر پر لیٹ جاؤں اور مہمان کو زمین پر سلا دوں''۔ ''نہیں میں بستر پر نہیں لیٹوں گی میں زمین پر ہی ٹھیک ہوں۔'' راگنی نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''کیوں بھائی، میرے بستر میں کانٹے لگے ہیں کیا۔ میرے کمرے میں رہوگی، میری چائے پی لوگی، میری کرسی پر بیٹھ جاؤ گی لیکن میرے بستر پر لیٹنے میں اعتراض ہے۔'' ''ٹھیک ہے نہ لیٹو آج میں بھی کرسی پر ہی رات گزار دونگا'' سنیل اپنے بستر پر پڑی ہوئی ایک چادر راگنی کی طرف اچھال دیتا ہے دوسری خود لے کر کرسی پر آ کر بیٹھ جاتا ہے۔ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ کبھی کبھی گشت کرتی پولس کی گاڑیوں کی آواز اس سناٹے کو توڑ دیتی۔ راگنی پھر سے سوچوں میں گم ہو گئی۔ گھر پر کیا ہو رہا ہوگا۔ اگر کرفیو کئی دنوں تک لگا رہا تو بھائی بہن کھانا کیسے کھائیں

گے۔ غریب گھروں میں کئی دن کا راشن نہیں ہوتا۔ سنیل میرے ساتھ زیادتی تو نہیں کرے گا، کچھ کرے گا تو کون روک لے گا۔ اگر سب کچھ نارمل بھی رہا تو کیا یہ سماج ایک غریب لڑکی کو رات گھر سے باہر گزارنے پر پاک دامن سمجھ لے گا۔

''میں سگریٹ پی لوں، تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔'' سنیل نے پھر اس کو خیالات کی دنیا سے نکال کر اپنے سامنے کھڑا کر دیا۔ وہ معصومیت سے اسے دیکھنے لگی۔ کیا یہ وہی سنیل ہے جس سے کالج کی سب لڑکیاں بچ کر گزرنا چاہتی ہیں۔ کیا یہ وہی لوفر اور بدمعاش ہے جو لڑکیوں پر پھول پھینکا کرتا ہے۔ آج اتنا شریف کیوں بن رہا ہے۔ کالج میں سگریٹ پی کر لڑکیوں کے منہ پر دھواں چھوڑ کر مزا لینے والا آج اپنے ہی گھر میں سگریٹ پینے کی مجھ سے اجازت مانگ رہا ہے۔ ''میم صاحب اگر آپ کو نہیں پسند ہے تو نہیں پیوں گا۔'' ''نہیں نہیں پی لو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' وہ سگریٹ سلگا کر پھر بولا ''تم سو جاؤ تمہیں نیند آ رہی ہوگی''۔ راگنی کو پلک جھپکانے میں بھی خطرہ لگ رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اب تیار کر رہی تھی کہ کب سنیل اس پر حملہ کرے گا اور وہ کس طرح بچاؤ کرے گی۔ سامنے رکھے سبزی کاٹنے والے چاقو کو دیکھ کر اسے کچھ ڈھارس بندھی تھی۔ سنیل پھر اسے اپنے پاس لے آیا۔ 'راگنی تم نے مجھے کالج میں دیکھا ہے۔ کالج میں میری جو شبیہ ہے اس سے تمہیں صرف نفرت ہوگی اور آج اچانک میرے کمرے میں پناہ لینے پر تم ڈر بھی رہی ہوگی کہ یہ لوفر سنیل نہ جانے کب تمہاری عزت سے کھیل لے۔ یہ سچ ہے کہ کالج میں میں تمہیں سب سے زیادہ تنگ کرتا تھا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ میں تمہیں بہت چاہتا ہوں۔' بڑی آسانی سے سنیل نے اپنی محبت کا اعتراف کر کے راگنی کے دل و دماغ کو بھک سے اڑا دیا۔ 'اس گھر میں تم ایک امانت ہو۔ میری اپنی امانت جس کی حفاظت مجھے خود کرنی ہے۔'' ''اب تم بے فکر ہو کر سو جاؤ صبح ملاقات ہوگی۔'' یہ کہہ کر سنیل چپ ہو گیا لیکن راگنی کے دل و دماغ میں شور اور بھی گہرا ہو گیا۔ سیدھے سادے انداز میں سنیل نے یہ کیا کہہ دیا۔ اسے بھی کوئی چاہ سکتا ہے۔ کیا واقعی وہ مجھے چاہتا ہے۔ یا اس وقت یہ مجھے جذباتی طور پر اکسانا چاہتا

ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ محبت کا جھانسا دے کر یہ مجھے حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ باہر کہیں دھما کہ ہوا اور بجلی چلی گئی۔ راگنی کا ڈر اور بڑھ گیا۔ ''میں موم بتی جلانے کے لئے اٹھ رہا ہوں تم گھبرانا نہیں۔'' یہ کہہ کر سنیل اٹھا اور موم بتی روشن کر دی۔ کمرے میں ہلکی روشنی کے ساتھ وہاں پھر وہی خاموشی چھا گئی۔ رات گزرتی رہی راگنی کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہوتی گئیں لیکن وہ سونا نہیں چاہتی تھی۔ زبردستی جاگتے رہنا چاہتی تھی۔ سنیل خاموشی سے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ ایک بار وہ سگریٹ کا کش لے کر جلتی ہوئی سگریٹ اپنی کلائی پر لگا لیتا۔ ایک دبی دبی سی سسکی اس کے منھ سے نکل جاتی۔ راگنی بڑی دیر سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر پر سنیل پھر وہی حرکت کرتا اور اس کے منھ سے کراہ نکل جاتی۔ اب راگنی سے نہ رہا گیا اور وہ پوچھ بیٹھی ''کیوں اپنے آپ کو جلا رہے ہو''؟ ''اپنے جذبات جلا رہا ہوں۔ راگنی یہ ڈھلتی ہوئی رات موم بتی کی مدھم روشنی، تمہاری بے پناہ خوبصورتی اور یہ تنہائی اس ماحول میں تو فرشتوں کے قدم بھی بہک جائیں میں تو بہت معمولی سا انسان ہوں۔ بار بار دل و دماغ بھٹکنے لگتا ہے تو تمہاری طرف سے دھیان کو ہٹانے کے لئے سگریٹ سے اپنے آپ کو جلا لیتا ہوں۔ سو جاؤ اب سسکی کی آواز بھی نہیں سنو گی۔'' سنیل یہ کہہ کر چپ ہو گیا۔

راگنی سوچنے لگی آگ کے گرد چند پھیرے یا نکاح کے چار کلمات ادا کرنے کے بعد عورت کی حفاظت کرنے کا عہد ہی تو ایک مرد کرتا ہے۔ اس کے بدلے میں ساری زندگی کے لئے عورت اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دیتی ہے اور میرے سامنے بیٹھا ہوا یہ شخص کتنا عظیم ہے کہ جو اپنے آپ سے بھی میری حفاظت کر رہا ہے۔'' اس کے قدموں میں تو میں اپنی جان بھی رکھ دوں تو کم ہے۔

راگنی ایک جھٹکے سے اٹھی اور سنیل کے پاس آ کر اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کے چہرے کو لیکر بے تحاشہ پیار کرنے لگی۔ وہ اسے چومتی جاتی اور کہتی جاتی آئی لو یو سنیل! آئی لو یو۔ میرے سنیل میں تمہاری ہوں صرف تمہاری۔۔۔

پولس کا چھاپا

شہر میں نئے ایس پی کی آمد سے جہاں عوام میں خوشی کی لہر تھی وہیں پولس محکمے میں سوگواری اور گھبراہٹ کا عالم تھا۔ جہاں عوام خوش تھے کہ ایک ایماندار اور ذمہ دار افسر آیا ہے اب زندگی چین سے گزرے گی وہیں پولس والے اداس تھے کہ نہ تو خود کھائے گا اور نہ ہمیں کھانے دے گا۔ ذرا سی چوک ہوئی اور نوکری خطرے میں۔

ذمہ داری اور ایمانداری کا نشہ ہر نشے سے زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ ایس پی صاحب نے چارج لیتے ہی شہر میں امن وسکون کا ماحول پیدا کر دیا۔ اب باری تھی شہر کے آس پاس کے علاقے کو درست کرنے کی۔

پہلی بار پوسٹنگ ہوئی تھی۔ شہر نیا تھا اسلئے بہت سی چوکیوں اور تھانوں کا پتہ نہیں معلوم تھا۔ رات کے ۱۱ بجے جب ایس پی صاحب ایک مشہور تھانے کا معائنہ کرنے جا رہے تھے تو راستے میں ایک عمارت کے باہر دو آدمی ایک عورت کے پیچھے بھاگتے ہوئے نظر آئے۔ رات کا سناٹا ایک عورت اور اس کے پیچھے دو آدمی وہ بھی بھاگتے ہوئے کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ ایسے مواقع پر عام آدمی رک جاتا ہے وہ تو ایس پی تھے۔ فوراً گاڑی رکوائی خود عمارت پر رک گئے اور ساتھ میں آئے ہوئے سپاہی اور ڈرائیور سے کہا ''ان بھاگنے والے آدمیوں کو پکڑ کر یہیں لے آؤ''۔

عمارت خالی پڑی تھی۔ دو کمروں میں بجلی کا بلب جل رہا تھا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ ایس پی صاحب نے چاروں طرف نظریں گھمائیں کہ کوئی مل جائے تو اس سے کچھ پوچھا جائے۔ جب کوئی آہٹ نہ ملی تو عمارت کے اندر چلے گئے۔ ایک کمرے میں دو پلنگ پڑے تھے۔ دوسرے کمرے میں

ایک میز اور چند کرسیاں تھیں۔ ایک کمرہ اسٹور کی طرح تھا جس کا دروازہ بند تھا۔ ایس پی صاحب نے دروازہ کھولا تو سامنے ہی کچھ کٹے اور چاقو پڑے مل گئے۔ اب کیا تھا کمرے کی ایک ایک چیز انہوں نے چھان ماری۔

جب ان کا سپاہی دو آدمی اور ایک عورت کے ساتھ واپس آیا تو ایس پی صاحب ایک کرسی پر بیٹھے کمرے سے برآمد ہونے والے سامانوں کی لسٹ تیار کر چکے تھے۔ ایک بوری میں اسمیک تھی، دو بوری میں دستی بم تھے، چھ عدد رامپوری چاقو، چار کٹے، تھوڑا تھوڑا گانجا اور افیم بھی برآمد ہوا تھا۔ آج کی اس کامیابی پر وہ خوش بھی تھے اور متحیر بھی کہ کسی نے بھی ان آدمیوں پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش نہیں کی جو اتنا دیدہ دلیری سے سڑک کے کنارے ان چیزوں کا ذخیرہ کیے ہوئے ہیں۔

ایس پی صاحب کا سامنا ہوتے ہوئے ہی دونوں آدمیوں نے سلوٹ کیا۔ ایس پی صاحب نے سلوٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے سپاہی سے کہا ان دونوں کے ہتھ کڑی لگا دو اور یہ سامان گاڑی میں رکھ دو کوتوالی میں جمع کرا دینا۔ سپاہی نے پھر ایک بار دونوں آدمیوں کو دیکھا پھر اپنے افسر کو دیکھا پھر ہکلاتے ہوئے بولا، ''سر یہ دروغہ جی اور دیوان جی ہیں''۔ ''دروغہ جی! دروغہ جی یہاں کیا کر رہے ہیں۔'' ایس پی صاحب نے پھر پوچھا اور یہ عورت یہاں کیا کر رہی تھی؟ اب دروغہ جی بھی حواس میں آچکے تھے سنبھل کر بولے، ''سر یہ کبھی کبھی آجاتی ہے''۔ ''رات میں؟ اور جب نہیں رکتی ہے تو دوڑا کر پکڑتے ہو۔ اس طرح کبھی کسی مجرم کو بھی دوڑا کر پکڑا ہے؟ اور یہ سب کیا ہے؟'' اپنے سامنے پڑے ہوئے چاقو کٹے اور بم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایس پی صاحب نے ڈانٹ لگائی۔ سر اسے تو رکھنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی ایسے لوگوں کو پکڑا جاتا ہے جن کی جیب سے کنگھی بھی برآمد نہیں ہوتی۔ تب یہی چاقو اور کٹے دکھا کر بند کرتے ہیں۔ یہ بم اسمیک افیم وغیرہ چھاپے کے دوران کام آتے ہیں۔ جب کسی کے گھر پر چھاپا مار دو اور اس کے یہاں سے کچھ بھی برآمد نہیں ہوتا تو

پولس کی بدنامی بھی ہوتی ہے اور الٹے پھنسنے کا خطرہ بھی ہوتا ہے۔اس لئے اپنے ساتھ یہ سب سامان لے کر جاتے ہیں۔ داروغہ جی نے بڑے مزے میں صفائی پیش کر دی۔

ایس پی صاحب کو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ گئی کہ کس طرح جرم پر قابو پانے کے بہانے معصوم لوگوں پر قابو پایا جاتا ہے۔آج تو میں چھوڑے جا رہا ہوں لیکن آئندہ بخشوں گا نہیں۔ ایک بات کان کھول کر سن لو یہ چوکیاں مجرموں کو پکڑنے کے لئے کھولی گئی ہیں مجرم بنانے کے لئے نہیں۔یہ کہہ کر ایس پی صاحب برآمد ہوئے سامانوں کے ساتھ چلے گئے۔۔۔۔

پیر صاحب

چرائی ہوئی رقم کو سنبھال کر رکھنا جمیل کے لئے مصیبت بن گیا تھا۔ کبھی اتنے پیسے ملے نہیں کہ بینک میں کھاتہ کھول کر جمع کرتا۔ نیاز صاحب کے یہاں دو وقت کھانے کے ساتھ پانچ سو روپئے ملتے تھے جسے وہ گھوم پھر کر ایک ہی مہینے میں خرچ کر ڈالتا تھا۔ دریادل مالک ملا تھا تنخواہ کے علاوہ کپڑے بھی بنوا دیتا تھا۔

بہت ہی چھوٹی عمر سے جمیل نیاز صاحب کے یہاں کام کر رہا تھا اس لئے وہ ایک نوکر سے کہیں زیادہ گھر کا ایک فرد بن گیا تھا۔ بیگم صاحبہ و نیاز صاحب نے اسے کبھی نوکر کی نظر سے دیکھا بھی نہیں۔ اکثر وہ لوگ گھر کو جمیل کے سپرد کر کے چل دیتے تھے۔ پورا گھر جمیل کی نگرانی میں رہتا تھا۔ ٹیلوفون کا بل کب جمع ہوگا، گیس کہاں سے آئے گی، گھر کا سامان کن کن دکانوں سے آتا ہے ان سب باتوں کی جانکاری نیاز صاحب و ساجدہ نیاز سے کہیں زیادہ جمیل کو تھی۔ گھر کے پیسے بچوں تک سے چھپائے جاتے ہیں لیکن گھر میں پیسے کہاں کہاں رکھے جاتے ہیں یہ بھی جمیل کو معلوم تھا۔ عجیب اتفاق تھا کہ نیاز صاحب اور ساجدہ بیگم کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ اللہ نے ہر طرح کا سکھ ان دونوں کو دے رکھا تھا بس اولاد کی نعمت سے محروم کر دیا تھا۔

اولاد کی تمنا میں نیاز صاحب اور ساجدہ بیگم نے ایسی کوئی درگاہ یا مزار نہیں چھوڑا جہاں جا کر دعا نہ مانگی ہو۔ لیکن اللہ کی مرضی۔ شادی کے ۹ سال گزر جانے کے بعد بھی یہ جوڑا بے اولاد تھا۔ چند دنوں سے مونی بابا کے کرشمے کی خبریں برابر اخباروں میں چھپ رہی تھیں۔ ٹی وی چینل

والوں نے بھی مونی بابا پر ایک مفصل رپورٹ نشر کی تھی جس میں سیکڑوں آدمی اپنی اپنی مرادیں لے کر مونی بابا کے آشرم پر جاتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ کچھ لوگ اپنی مرادیں پوری ہو جانے پر شکرانہ ادا کرنے آئے تھے۔ ساجدہ بیگم نے جس دن سے مونی بابا کا چمتکار ٹی وی پر دیکھا تھا اسی دن سے وہ نیاز صاحب کے پیچھے پڑی ہوئی تھیں کہ چلئے ہم لوگ بھی مونی بابا کے آشرم میں جا کر اولاد کی منّت مانگیں۔ نیاز صاحب نے لاکھ سمجھایا کہ جب اللہ نے قسمت میں اولاد ہی نہیں لکھی تو مونی بابا کہاں سے دے دیں گے لیکن ساجدہ بیگم کے یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔

عورتیں بڑی جلدی سب پر یقین کر لیتی ہیں اس لئے ساجدہ بیگم نے ضد پکڑ لی کہ ہم لوگ بھی مونی بابا کے پاس جا کر بچے کی بھیک مانگیں گے۔ بیگم کا دل رکھنے کے لئے نیاز صاحب نے مونی بابا کے آشرم پر جانے کا پروگرام بنالیا۔ چار گھنٹے کا سفر تھا اس لئے دونوں سویرے ہی کار سے مونی بابا کے آشرم کے لئے نکل پڑے۔ گھر میں جمیل اکیلا رہ گیا۔ نیاز صاحب نے پہلے بھی کئی بار جمیل پر گھر چھوڑا تھا۔ وہ گھر کی صفائی سے فرصت پا کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتا اور پورا دن ٹی وی دیکھتے گزر جاتا۔

آج بھی جمیل ٹی وی پر فلم دیکھ رہا تھا۔ اس میں ایک معمولی غریب آدمی بینک میں ڈاکہ ڈالتا ہے پھر اسی پیسوں سے دوسری جگہ جا کر ایک عالیشان مکان بنوا کر عیش کی زندگی گزارنے لگتا ہے۔ ایک ارب کی آبادی میں بینک لوٹنے والے کو پولس تلاش کرنے میں ناکام رہتی ہے۔

کچے ذہن پر اس فلم نے بہت گہرا اثر چھوڑا۔ جمیل کے دل میں یہ خیال آیا کہ وہ کب تک نیاز صاحب کے گھر نوکر بن کر رہے گا۔ اسے بھی تو ترقی کرنے کا حق ہے۔ اس کے پاس بھی ایک بنگلہ اور کار ہونی چاہئے۔ برسوں کی ایمانداری اور وفاداری پر شیطان حاوی ہونے لگا۔ نیاز

صاحب کے احسانات کو بھول کر گھر کا بچہ اب صرف ایک پرایا نوکر بن گیا۔ چند منٹوں میں جمیل نے ہر اس جگہ سے رقم بٹور لی جو اس کی نگرانی میں نیاز صاحب چھوڑے رہتے تھے۔ بیگم صاحبہ کی کھلی الماری میں روزانہ پہنے والے زیور بھی کافی قیمتی تھے۔ گھر کا چوکیدار ہی گھر کا لٹیرا بن کر نکل گیا۔

دیر رات جب نیاز صاحب اور ساجدہ بیگم مونی بابا کے آشرم سے واپس آئے تو لگ بھگ پانچ لاکھ کی لوٹ نے انہیں بھی مون ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ نیاز صاحب اور ساجدہ بیگم کو گھر کے لٹ جانے سے کہیں زیادہ دکھ یقین کو ٹھیس پہنچنے کا تھا۔ بہت ہی چھوٹی عمر سے جمیل کو اپنا لیا تھا۔ پولس میں رپورٹ کر کے کچھ بھی حاصل نہیں ہونا تھا سوائے اس کے کہ لوٹ کی خبر دے کر اور دس لٹیروں کو دعوت دینا۔ اسلئے دونوں صبر کر کے بیٹھ گئے۔

لاکھوں کی مالیت کی نقدی اور زیورات لے کر جمیل بھاگ تو آیا تھا لیکن اتنی بڑی رقم کو رکھنے کا مسئلہ تھا۔ چوری کا مال رکھا کہاں جائے۔ کس کے پاس رکھایا جائے۔ اس مسئلے کا حل تلاش کرنے میں کئی دن گزر گئے اور جمیل ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف بھاگتا رہا۔ بڑھی ہوئی داڑھی اور بے رونق چہرے سے وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ بڑا لگنے لگا۔ ابھی تک جمیل نے رات کسی ہوٹل یا گیسٹ ہاؤس میں گزارنے کا خطرہ مول نہیں لیا تھا۔ وہ دن بھر اپنا پرانا بیگ لئے ادھر ادھر گھومتا رہتا اور رات میں عام فقیروں کی طرح کسی درگاہ یا مزار کے چبوترے پر تھیلے کو سر کے نیچے رکھ کر سو جاتا۔ کسی کو پتہ بھی نہ لگتا کہ یہ پھٹے حال فقیر لاکھوں کا آدمی ہے۔ پولس کے خوف سے وہ ایک دن سے زیادہ کسی جگہ بھی نہیں ٹھہر رہا تھا۔ آج جس شہر میں اس نے قدم رکھا تھا وہاں اسے نہ تو کوئی درگاہ دکھائی دی اور نہ ہی مزار۔ اب رات کہاں گزاری جائے یہ سوچ کر وہ دوپہر سے ہی

پریشان تھا۔ گھر سے بھاگے ہوئے آج کئی دن گزر چکے تھے لیکن ابھی تک پولس نے اسے نہیں پکڑا تھا۔ اسلیئے پولس کا ڈر کافی حد تک ختم ہو چکا تھا۔ بازار سے گزرتے وقت ہرے رنگ کے دوپٹے دیکھ کر اس کے دل میں بجلی کی طرح ایک خیال کوندا کہ وہ بھی تو کسی مزار کا مجاور بن سکتا ہے۔ لیکن آج کی اس کمپٹیشن سے بھری مارکیٹ میں اسے کون سا مزار خالی ملے گا۔ یہی سب سوچتا ہوا وہ دکان کے اندر آگیا۔ اس نے ایک درجن ہرے پیلے ڈوپٹے اور کڑھی ہوئی ہری لال چادریں خریدیں۔ بازار میں پھول بیچنے والے بھی مل گئے جن سے اس نے کچھ پھول مالائیں بھی خرید لیں۔ اب ایک مزار کا پورا سامان اس کے پاس موجود تھا بس ضرورت تھی ایک جگہ کی جہاں وہ مزار بنا کر بیٹھ سکے۔ دن بھر تلاش کرنے کے بعد شہر سے کچھ دور ایک پولس چوکی کے پیچھے جنگل میں اسے ایک جگہ مل گئی۔

رات کے اندھیرے میں اس نے کافی گہرا گڑھا کھود کر پلاسٹک کی تھیلی میں نقدی اور زیورات رکھ کر پاٹ دیا۔ اس کے بعد ایک قبر کی طرح مٹی کو برابر کر کے اس پر ہری لال چادر بچھا دی۔ پیلے ہرے ڈوپٹے بھی آس پاس کے پیڑوں پر لٹکا دیئے۔ بازار سے لائی ہوئی چند مالاؤں کو اس نے اپنے گلے میں ڈال لیا اور باقی کے پھولوں کو مسل کر تازہ بنے مزار پر ڈال دیا۔ جمیل نے لوٹے ہوئے زیور اور رقم کی حفاظت کا انتظام تو کر دیا تھا لیکن چوکی پر موجود سپاہیوں سے خطرہ تھا کہیں وہ صبح ''میدان'' جانے کے لئے ادھر آگئے تو اسے دیکھ کر ضرور پوچھ تاچھ کریں گے۔

رات بھر جمیل جاگتا رہا صبح وہی ہوا جس کا اسے ڈر تھا۔ دو سپاہی لوٹا لئے جنگل کے اندر جانے لگے تو اسے دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔ جمیل نے انہیں ترچھی نظر سے دیکھ کر آنکھ بند کر لی اور جھومنے لگا۔ مزاروں پر بیٹھے فقیروں کی ایک ایک ادا اسے یاد تھی۔ دونوں سپاہی لوٹا لئے اس کے

پاس آ گئے۔ 'کون ہو تم'؟ عادت کے مطابق ایک سپاہی نے ڈپٹ کر پوچھا۔ جمیل نے دھیرے دھیرے اپنی آنکھیں کھولیں اور خاموشی سے دونوں سپاہیوں کو گھورنے لگا۔ رات بھر کی جگائی نے اس کی آنکھوں کو لال کر رکھا تھا۔ جمیل کی لال آنکھیں اور اس کے چہرے کے رعب کو دیکھ کر دونوں سپاہی گھبرا گئے۔ دوسرے سپاہی نے جلدی سے کہا 'بابا آپ کون ہیں'۔ 'ہم ''سیوا شاہ'' کے شاگرد ہیں بابا نے ہم کو حکم دیا ہے کہ اس چوکی کے پیچھے ان کے ایک مرید ''چوکی شاہ'' کی قبر ہے اس پر جا کر قوالی کرو۔ ہم یہاں اسی لئے آئے ہیں۔' جمیل نے سپاہیوں کے اگلے سوال سے پہلے ہی چادر پر پڑے ہوئے پھولوں کو سپاہیوں کو دیتے ہوئے کہا 'اسے اپنے پاس رکھو جب تک یہ پھول تمہارے پاس رہیں گے لچھمی تم پر مہربان رہے گی۔' اتنا کہہ کر جمیل نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ سپاہی پھول لے کر چلے گئے۔ جمیل کی یہ پہلی کامیابی تھی۔ شام کو جب وہ دونوں سپاہی ایک ڈبہ مٹھائی، پھول مالا اور اگربتی لے کر آئے تو جمیل سمجھ گیا کہ آج سپاہیوں نے لمبا ہاتھ مار دیا۔ دوسرے ہی دن سے سپاہیوں کے ساتھ داروغہ جی بھی بڑی عقیدت و احترام کے ساتھ جمیل سے مزار کے پھول لینے لگے۔

دھیرے دھیرے چوکی شاہ کے مزار پر بھیڑ بڑھنے لگی۔ جمعرات اور جمعہ کے دن اتنی بھیڑ آ جاتی کہ چوکی کے سپاہیوں کو کنٹرول کرنا پڑتا۔ چوکی شاہ کے نوجوان پیر صاحب کا ڈنکا دور دور تک بجنے لگا۔ چوکی شاہ کا مزار اب پکہ بن چکا تھا۔ مزار کے چاروں طرف ایک جالی دار حجرہ بنا تھا جس کے اندر سوائے پیر صاحب کے اور کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ مزار پر آنے والے زائرین مزار کے حال میں یا دالان اور آنگن میں بھرے رہتے۔ مزار کا کام سنبھالنے کے لئے جمیل نے چار آدمی رکھ لئے تھے۔ پیر صاحب یعنی جمیل اب صرف

جمعرات اور جمعہ کے دن مریدوں کو زیارت کا موقع دیتے تھے۔ پانچ دن وہ کہاں جاتے کہاں رہتے اس بات کا پتہ کسی کو نہیں تھا۔ مزار پر رہنے والے اور آنے والے مریدوں کو یہ بتایا گیا تھا کہ پیر صاحب ہفتہ میں پانچ دن کسی سنسان مقام پر جا کر عبادت کرتے ہیں۔ جمیل نے صرف پانچ سالوں میں پیر صاحب کے نام سے اتنی شہرت حاصل کر لی تھی کہ بڑے بڑے افسروں کے علاوہ وزرا اور لیڈران بھی مزار پر حاضری دینے آنے لگے۔

کچی قبر میں رکھی لوٹ کی رقم سے جمیل نے زمینیں خرید کر کمپلیکس بنوالیا تھا اس کے بعد تو اس کے پاس دولت کا انبار لگ گیا۔ چوکی شاہ کے مزار پر چڑھاوے کی رقم سال میں کروڑوں کی ہو جاتی جس کو کسی ماہر صنعت کار کی طرح اس نے غیر ممالک میں انویسٹ کر رکھا تھا۔ ہفتہ کے پانچ دن غیر ملکی کاروبار کو سنبھالنے کے لئے اسے جانا پڑتا۔ چوکی شاہ کے مزار کا پیر بیرون ملک میں تھری پیس سوٹ میں نظر آتا۔

چوکی شاہ کی شہرت نیاز صاحب اور ساجدہ بیگم کے کانوں میں بھی پڑی۔ اولاد کی دیرینہ خواہش ایک جمعرات اس جوڑے کو بھی چوکی شاہ کے مزار پر کھینچ لائی۔ بھاری بھیڑ میں آج نیاز صاحب بھی موجود تھے جن کی لوٹی ہوئی رقم کو چھپانے کے چکر میں جمیل پیر صاحب بن گیا تھا۔ پیر صاحب سے مراد کے پھول لینے کی لائن میں سیکڑوں لوگ کھڑے تھے۔ نیاز صاحب اور ساجدہ بیگم بھی اسی لائن میں لگ گئے۔ ساجدہ نے جب گڑگڑاتے ہوئے پیر صاحب سے کہا کہ بابا کیا ہمارے آنگن میں بھی کبھی خوشیاں آئیں گی تو برسوں تک سنی ہوئی آواز جب جمیل کے کانوں میں پہنچی تو ایک بارگی اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے نیاز صاحب اور ساجدہ بیگم کھڑے تھے۔ یہ دونوں تو جمیل کو نہ پہچان سکے مگر جمیل اپنے سرپرستوں کو پہچان گیا۔ ایک لمحے کے لئے اسے محسوس

ہوا کہ وہ ان دونوں کے سامنے ننگا کھڑا ہے لیکن اپنے آپ کو اس نے سنبھال لیا۔ اس کام میں اب وہ اتنا آگے بڑھ چکا تھا کہ اس کے ضمیر کو جاگنے اور مرنے میں ذرا بھی وقت نہیں لگتا تھا۔ جمیل نے مزار کے پھول اٹھائے اور چڑھاوے کی ریوڑیاں ساجدہ بیگم کی جھولی میں ڈال دیں۔ 'جاؤ تمہارے آنگن میں بہت جلد ایک پھول کھلے گا۔' یہ کہہ کر وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

ایک سال کے بعد جب ساجدہ بیگم خوشی خوشی اپنی گود میں ایک بچے کو لئے چوکی شاہ کے مزار پر منت اتارنے آئیں تو پیر صاحب نے اپنے خاص چیمبر میں نیاز صاحب اور ساجدہ بیگم کو لا کر بٹھایا۔ پہلی بار پیر صاحب نے کسی مرید کو اپنے حجرے میں آنے کی دعوت دی تھی۔ سیکڑوں لوگوں کے ساتھ مزار کے سبھی ملازمین اس چمتکار کو دیکھ کر متحیر تھے۔ پیر صاحب نے ایک خوبصورت بریف کیس نیاز صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ "اس بریف کیس میں دس لاکھ کی رقم اور چند جائداد کے کاغذات ہیں جو میری طرف سے آپ کے بیٹے کے لئے تحفہ ہے"۔ ساجدہ بیگم کے ساتھ نیاز صاحب بھی پیر صاحب کے اس سلوک سے اپنے جذبات کو نہ روک سکے۔ نیاز صاحب نے بھاری آواز میں کہا کہ "پیر صاحب آپ کی دعاؤں نے ہماری کئی سال سے ویران دنیا کو آباد کر دیا اس سے بڑی دولت اور کیا ہو سکتی ہے"۔ اب پیر صاحب کی آنکھوں میں آنسوں تھے۔ یہ بچہ آپ کو اللہ نے آپ کی نیکیوں کے بدلے میں دیا ہے۔ میرے جیسے گناہگار کی دعاؤں میں اتنا اثر کہاں کہ کسی کی مراد پوری کر سکوں۔ 'ابو آپ کے نالائق اور بے وفا بیٹے اور ایک لٹیرے کی طرف سے اپنے چھوٹے بھائی کے لئے یہ ایک تحفہ ہے۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجئے گا میں آپ کا جمیل ہوں۔'

نیاز صاحب پیر صاحب کے منھ سے جمیل کا نام سن کر سکتے میں آگئے۔ ساجدہ بیگم تو ایک

ٹک پیر صاحب کو دیکھے جا رہی تھیں۔ جس پیر صاحب کے چہرے پر کسی نے مسکراہٹ تک نہ دیکھی تھی وہی پیر صاحب اس وقت روئے جا رہے تھے اور گھر سے بھاگ کر پیر صاحب بننے تک کی کہانی سنا رہے تھے۔ جمیل عرف پیر صاحب نے کہا ابو! یہ کہانی میں نے آپ کو اس لئے سنائی کہ اپنے جرم کی آپ سے معافی مانگ سکوں۔ لیکن آپ کو قسم ہے اپنے بچے کی کہ اس کہانی کو کسی سے بتائے گا نہیں ورنہ مزاروں پر سے لوگوں کا یقین ختم ہو جائے گا۔۔۔

زباں کا لطف کہیں بے زباں اٹھاتے ہیں

انسانی جسم کے بے شمار اعضاء میں زبان پروردگار کا ایک بہترین عطیہ ہے۔ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ آپ کے منہ میں رکھا ہوا گوشت کا یہ چھوٹا سا ٹکڑا جسے آپ زبان کہتے ہیں نہ جانے کتنوں کی روزی روٹی کا وسیلہ بنا ہوا ہے۔ وکلا صاحبان اسی کی بدولت چرب زبانی کر کے اپنی پریکٹس چمکا رہے ہیں تو ہمارے رہنماؤں نے بھی اسی کا سہارا لے کر جھوٹے سچے وعدے کر کے اقتدار کے گلیاروں میں اپنی جگہ بنائی ہے۔ خطیب کی خطابت اور مقرر کی تقریر سبھی کچھ اسی زبان کی محتاج ہے۔

ہر عمر اور وقت کے لحاظ سے زبان کی لذت اٹھائی جاتی ہے۔ بچوں کی توتلی زبان اگر لوگوں کو محظوظ کرتی ہے تو بڑوں کی صاف وشفاف زبان دلوں کو موہ لیتی ہے۔ بڑے اگر تتلا کر بولیں تو عیب لگتا ہے۔ اور بچے اگر بڑی بڑی باتیں صاف زبان میں کرتے ہیں تو بقراطیت کا خطاب پاتے ہیں۔

اس کرۂ عرض پر بسنے والے ہر شخص کو اللہ نے ایک جیسی زبان سے نوازہ ہے۔ اس کی بناوٹ اس کا استعمال سب کچھ ایک جیسا ہے۔ لیکن مفاد پرست انسانوں نے اپنے منہ میں رکھی ہوئی زبان پر اپنی خود کی ایجاد کی ہوئی زبان کو اس حد تک فوقیت دے دی ہے کہ اس کو باقی رکھنے کے لئے یا دوسروں کی زبان کو ختم کرنے کے لئے ایک دوسرے کو قتل کرنے میں بھی عار محسوس نہیں کرتا۔ زبانوں کے جھگڑے کو لے کر اب تک دنیا میں نہ جانے کتنا خون بہایا جا چکا ہے۔

آج وہی زبانیں زندہ اور کامیاب ہیں جو دوسری زبانوں کی نہ صرف قدر کرتی ہیں بلکہ انہیں اپنے میں سمونے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانے یا اپنے خیالات اور نظریات کو فروخت کرنے کے علاوہ زبان کا دوسرا اہم استعمال معدے میں پہنچنے والی ہر شئے کی لذت سے لطف اندوز ہونا بھی ہے۔ کسی بھی چیز کی لذت کا پتہ صرف زبان سے چلتا ہے۔ جو زبان کی نعمت سے محروم ہیں وہ کیا جانیں کہ آم کتنا میٹھا ہوتا ہے یا املی میں کس قدر کھٹاس ہوتی ہے۔

بتیس دشمنوں کے بیچ اپنے آپ کو صحیح سلامت بچا کر رکھنا یہ زبان کا ہی کمال ہے۔ ذرا سی چوک ہوئی اور دانتوں نے کچا چبایا۔ مگر واہ رے امن پسندی ادھر دانتوں میں کوئی چیز پھنسی اور زبان نے سارے گلے شکوے بھلا کر اسکی مدد شروع کر دی۔ جب تک گھوم گھوم کر اس پھنسنے والی شئے کو بے دخل نہیں کر دیتی تب تک چین سے نہیں بیٹھتی۔

اس حسین ترین شئے کی لذتوں کے ساتھ اس کی مار بھی بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ یہ ننھی سی جان اگر دلربائی پر آتی ہے تو آپ کی جوتی دوسروں سے اٹھوا دیتی ہے۔ اور اگر بے عتنائی پر آ گئی تو بھرے بازار میں دوسروں کے جوتے ہوں گے اور آپ کا سر۔

اس چھوٹی سی قیامت کے خالق کو پتہ تھا کہ یہ کیا کیا فتنہ کھڑا کر سکتی ہے اسی لئے اس کی شگفتگی اور نرمی برقرار رکھنے کے لئے ہڈی جیسی سخت چیز سے اسے محروم کر دیا۔ اس کی حفاظت بھی مقصود تھی جس کے لئے ایسی چکناہٹ عطا کی کہ آپ کی گرفت میں نہ آ سکے۔ زبان آپ کے حوالے اس ہدایت کے ساتھ کی گئی کہ اسے عقل سے کنٹرول کرنا۔ اگر بے قابو چھوڑ دو گے تو یہ فساد کھڑا کر کے خود تو غائب ہو جائے گی اور تمہارا پورا وجود عتاب کا شکار ہو جائے گا۔

زبان کی ستم ظریفی ہمیں روز دیکھنے کو ملتی ہے۔ محترمہ گالی دے کر خود تو منہ کے اندر غائب ہو جاتی ہیں اور پٹتا ہے بے چارہ جسم۔ معصوم ہاتھ پیر توڑے جاتے ہیں۔ خطا کسی کی اور سزا کسی اور کو

ملتی ہے۔

یہی حال چٹورے پن کا ہے ذرا سے نمک کے ذائقہ کی خاطر اچھے خاصے آدمی کو بلڈ پریشر کا مریض بنا ڈالا۔ جو مٹھاس اللہ نے زبان کو اپنے پاس رکھنے کے لئے دی تھی اسے پورے جسم میں منتقل کر کے انسان کو شکر کا مریض بنا دیا۔ بڑے سے بڑے بخیل جو زبان سے ایک میٹھا جملہ نکالنے سے گریز کرتے تھے اب سیروں شکر پیشاب میں بہانے پر مجبور ہیں۔

زبان کا لطف نہ تو زبان دراز اٹھا سکتے ہیں نہ بے زبان اٹھاتے ہیں۔ اس کا لطف اٹھانے کے لئے نفس پر قابو پانا بہت ضروری ہے۔ کم کھایئے اور کم بولئے کے مقولے پر عمل کیجئے گا تب ہی اس کی لذتیں آپ کو نصیب ہوں گی۔ زبان کو جہاں آپ نے بے لگام چھوڑا وہیں سے آپکی رسوائی اور محرومیاں شروع ہو جائیں گی۔۔۔

کاش ہم جانور ہوتے (ایک سوچ)

اس کے سامنے بہت سارے اخبارات پڑے تھے۔ وہ جلدی جلدی ایک ایک خبر پڑھ رہا تھا۔ چند خبروں پر نشان بھی لگاتا جارہا تھا۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو وہ پسینے سے تر بتر سرخ آنکھوں سے مجھے گھورنے لگا۔ میں نے پوچھا، کیا بات ہے؟ آج تم بہت پریشان لگ رہے ہو؟ اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے میری طرف کچھ اخبار بڑھا دیئے۔ ''ذرا نشان لگی ہوئی خبریں پڑھنا۔'' میں خبریں پڑھنے لگا۔

ایک خبر☆ بہت دنوں سے پریشان کرنے والے ایک بندر کو ایک سپاہی نے اپنی بندوق سے مار دیا۔ گاؤں والوں نے تھانے کا گھیراؤ کر کے سپاہی کو معطل کرنے کی مانگ کی۔ سیاسی پارٹیوں نے بھی سپاہی کے خلاف کاروائی کیئے جانے کی اپیل کی ہے۔ کیوں کہ بندر مارنا قانوناً جرم ہے۔

دوسری خبر☆ کار کے نیچے آکر ایک سور کے مرجانے سے دو گروپوں میں زبردست فائرنگ۔ ضلع مجسٹریٹ نے کار کے مالک سے معاوضہ دلا کر معاملے کو ختم کرایا۔

تیسری خبر☆ دو فرقوں میں خونریز تصادم۔ چار آدمی ہلاک۔ محلے میں ایک گائے کا کٹا ہوا پیر ملنے سے حالات بے قابو۔ شہر میں کرفیو۔ دیکھتے ہی گولی مارنے کا حکم۔

چوتھی خبر☆ ایک ہرن کا شکار کرنے پر مشہور فلم اسٹار گرفتار۔ جج صاحب نے پانچ سال کی سزا سنائی۔ ہرن کے چاہنے والوں نے گھروں میں چراغاں کیا اور مٹھائیاں تقسیم کیں۔

میں ان خبروں کو پڑھ کر اسے دیکھنے لگا۔ اس نے کہا اب ان سارے اخباروں میں یہ بھی دیکھو کہیں میرے بیٹے کے مارے جانے پر بھی کسی نے احتجاج کیا ہے۔ جسے پچھلے فساد میں میری آنکھوں کے سامنے پولس نے مار ڈالا تھا۔ یہ کہہ کر وہ پھر کمرے کی چھت کو تکنے لگا اور میں سوچنے لگا کہ اگر ہم جانور ہوتے تو کیا زیادہ محفوظ نہ ہوتے ؟؟؟

کچی بنیادیں

شاہدہ بیگم کی خوشگوار زندگی میں اس گھڑی زہر گھل گیا جب شادی کے پانچ سال بعد ساجد کا فون آ گیا۔ وہ تیار ہو کر اپنے بیٹے عادل کو اسکول سے لانے جا رہی تھی۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی تو اس نے یہ سوچ کر فون اٹھالیا کہ شاید سلمان اسے عادل کو اسکول سے لانے کے لئے یاد دلا رہے ہیں۔ لیکن یہ فون تو ساجد کا تھا۔ جو سات سال پہلے اس کی زندگی کا سب سے ضروری حصہ ہوا کرتا تھا۔

اس کے ہیلو کے جواب میں ساجد نے کہا ''شکر ہے کی تم نے فون اٹھالیا ورنہ ایک کال بیکار ہو جاتی۔''

''ہیلو آپ کون ہیں؟'' وہ ابھی ساجد کو نہیں پہچان پائی تھی۔

''ایک کروڑ پتی کی بیوی بن جانے کے بعد کیا پرانے عاشق کو پہچاننا بھی چھوڑ دیا؟'' ساجد نے بڑے پھوہڑ انداز میں طعنہ دیا۔

''تم کہاں ہو؟ کیسے ہو؟ میرا پتہ تمہیں کیسے ملا؟ میرا فون نمبر تمہیں کس نے دیا؟'' شاہدہ نے ایک ساتھ بہت سارے سوال کر ڈالے۔

''ایک چھوٹے سے شہر میں سلمان جیسے کروڑ پتی کا فون نمبر معلوم کر لینا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔'' اب یہ سب چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ ہم لوگ کہاں مل رہے ہیں؟'' ساجد نے کہا۔

شاہدہ کو ایک دم سے احساس ہوا کہ وہ ایک کنواری لڑکی نہیں ہے، ایک ذمہ دار شخص کی بیوی بن چکی ہے۔ ایک بچے کی ماں بھی ہے۔

''ساجد اب میں تم سے نہیں مل سکتی۔'' میری شادی ہو چکی ہے۔'' اس نے ساجد کو ٹکا سا جواب دے دیا۔

''شادی تو تمہاری مجھ سے بھی ہوگئی تھی، بس نکاح ہی تو نہیں ہوا تھا۔'' ساجد نے بڑی بے رحمی سے کہا۔

ساجد کی اس بات پر وہ شرمندہ ہوگئی۔

''دیکھو ساجد اب میں کسی کی امانت ہوں، میری زندگی میں زہر نہ گھولو، بیتی باتوں کو بھول جاؤ، مجھے اب کبھی فون مت کرنا۔'' یہ کہہ کر شاہدہ نے فون کاٹ دیا۔

فون تو کٹ گیا لیکن خیالات کی ڈور جڑی رہی۔ شاہدہ کا خوبصورت چہرہ مرجھا گیا۔ وہ بے دلی سے اسکول گئی اور عادل کو لے کر گھر آ گئی۔

شام کو سلمان نے اس کے مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کہا ''کیا بات ہے، آج تم کچھ زیادہ ہی تھکی ہوئی لگ رہی ہو؟'' کیا باورچی خانے میں کچھ زیادہ کام کرلیا۔ میں نے تو کئی بار کہا کہ جب نوکروں کی فوج گھر میں ہے تو خود کو کیوں پریشان کرتی ہو؟''

شاہدہ نے بڑی حسرت سے اپنے چاہنے والے شوہر کو دیکھا اور سوچنے لگی کہ اگر سلمان کو اس کے بیتے دنوں کے بارے میں معلوم ہو جائے تو وہ اس سے کتنی نفرت کرنے لگیں گے۔ ایک پھیکی سی مسکراہٹ بکھیر کر وہ چپ رہی۔

اگلے دن سلمان دفتر جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ وہ جلدی جلدی ان کے لئے ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ فون کی گھنٹی بجی تو کچن کے پاس رکھے ہوئے فون کو اس نے اٹھالیا۔

اس کے ہیلو کے جواب میں ساجد بولا ''میں صرف اور صرف تمہارے لئے اس شہر میں آیا ہوں۔ اب تمہارے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ پہلا یہ کہ تم مجھ سے ملتی رہو یا پھر راز کو راز رکھنے کی

قیمت ادا کرو۔

شاہدہ نے ڈرتے ڈرتے کہا ''کیا تم مجھے بلیک میل کرو گے؟''

''تمہارے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتا تو تمہاری دولت کے سہارے گزاروں گا۔ پہلی قسط پانچ لاکھ روپے کی ہوگی جو مجھے جلد ہی مل جانی چاہیے۔'' یہ کہہ کر اس نے فون کاٹ دیا۔

پسینے میں تر بتر شاہدہ نے ریسیور رکھ کر سلمان کے کمرے کی طرف دیکھا۔ اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ سلمان آئینے کی طرف رخ کر کے ٹائی باندھ رہے ہیں۔

ٹیبل پر ناشتہ لگا کر وہ سلمان کے ساتھ خاموشی سے ناشتہ کرتی رہی۔ سلمان حسب معلوم اس سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے۔ جس کا وہ کبھی مسکرا کر تو کبھی سنجیدگی سے جواب دے دیتی۔

شاہدہ کی پریشانی سلمان نے بھی محسوس کی۔ لیکن اس سے پوچھنا انہوں نے مناسب نہیں سمجھا۔ سلمان دفتر چلے گئے اور شاہدہ ماضی کی یادوں میں گم ہوگئی۔

شکل وصورت میں شاہدہ پورے خاندان میں سب سے اچھی تھی۔ تعلیم بھی دوسروں سے زیادہ تھی۔ شاہدہ کے گھر میں ساجد کا آنا جانا تھا۔ ساجد شاہدہ کا دور کے رشتہ کا بھائی تھا۔ اس لئے کسی کو اس کے آنے جانے پر اعتراض بھی نہیں تھا۔

ساجد کی خوبصورت پرسنالٹی پر خاندان کی سبھی لڑکیاں فدا تھیں۔ لیکن ساجد شاہدہ کو دل دے بیٹھا تھا۔ شاہدہ بھی ساجد کو پسند کرتی تھی اور یہ پسند محبت میں بدل گئی۔

ایک سنسان دوپہر میں محبت کی انتہا ہوگئی۔ شاہدہ گھر میں اکیلی تھی اسی بیچ ساجد آ گیا اور دو جوانیوں نے اس پھل کو چکھ لیا جس پھل کو شادی سے پہلے کھانے سے منع کا جاتا ہے۔

سب کچھ لٹانے کے بعد جب شاہدہ کو ہوش آیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ساجد نے اسے سمجھایا کہ چند دنوں کے بعد وہ اس کی دلہن بن جائے گی۔ اس لیے پریشان ہونے کی

ضرورت نہیں ہے۔

ساجد نے تنہائی میں ہوئے گناہ کو ایک معمولی سی بھول کہہ کر شاہدہ کو دلاسہ دینے کی کوشش کی۔

محبت کا بھوت اتر جانے کے بعد ہر لڑکی کی طرح شاہدہ نے بھی ساجد سے پوچھا ''مجھ سے شادی کرو گے نا''

ساجد نے باہوں میں بھر کر اسے یقین دلا دیا۔

اس کالی دوپہر کے بعد ساجد اور شاہدہ کی سہاگ رات کا مہورت نہ نکل سکا۔ ساجد آگے کی پڑھائی کرنے دوسرے شہر چلا گیا اور پھر بجائے پڑھائی کے وہ سب کچھ کرنے لگا جس سے خاندان والوں کی بدنامی ہوتی رہے۔

یہ بھی خبر آئی کہ وہ غنڈہ گردی اور اسمگلنگ کے الزام میں جیل بھی جاتا رہتا ہے۔

اسی بیچ شاہدہ کیلئے سلمان کا رشتہ آیا تو شاہدہ سے دس سال بڑے سلمان کے رشتہ کو گھر والوں نے ایک منٹ بھی سوچے بغیر قبول کر لیا۔

دولت مند سلمان کے ساتھ وہ پانچ سالوں سے ایک شاندار زندگی گزار رہی تھی۔ ان پانچ سالوں میں سلمان سے اسے معمولی سی شکایت بھی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اب ساجد نے اس کو پریشان کر دیا تھا۔

اچانک فون کی گھنٹی بجی تو سلمان کا فون سمجھ کر وہ دوڑ پڑی۔ لیکن فون پر تو ساجد تھا۔

وہ بولا ''مجھے پیسوں کی سخت ضرورت ہے، کل شام تک تم پانچ لاکھ روپئے تیار رکھنا ورنہ اس دوپہر کا قصہ شام کو سلمان کو سناؤں گا۔''

''میرے پاس اتنی بڑی رقم نہیں ہے۔'' شاہدہ نے کہا۔

"انتظام کرو شوہر سے مانگو یا گہنے بیچو۔ تمہارے پاس دس بیس لاکھ روپیوں کے تو زیور ہی ہونگے۔" یہ کہہ کر اس نے فون کاٹ دیا۔

شاہدہ سوچنے لگی کہ اگر ایک بار ساجد کو رقم دے دی تو وہ زندگی بھر اسے بلیک میل کرتا رہے گا۔ روز روز ڈر ڈر کر مرنے سے بہتر ہے کہ سلمان کو سب کچھ بتا دے۔ لیکن سلمان اس کا سچ جاننے کے بعد کیا اسے معاف کر دیں گے۔ وہ اس سے نفرت نہیں کرنے لگیں گے۔ پھر کیا ہوگا؟ ساری زندگی کی بدنامی۔

ایک طلاق شدہ عورت اور طلاق کی وجہ شادی سے پہلے کسی سے تعلقات۔ ایسے میں خودکشی سب سے اچھا راستہ ہے۔ لیکن عادل کا کیا ہوگا؟ وہ تو ابھی بہت چھوٹا ہے۔ سلمان نے اگر دوسری شادی کر لی تو سوتیلی ماں عادل کے ساتھ کیا برتاؤ کرے گی؟

کسی بھی نتیجہ پر پہنچے بغیر وہ کھڑی ہوگئی۔ اس نے اتنا ضرور طے کر لیا تھا کہ وہ اب ساجد کی حوصلہ افزائی نہیں کرے گی۔

ساجد کا دو تین بار فون آیا لیکن اس نے یہ کہہ کر کاٹ دیا کہ اس کا جو دل چاہے کرے۔ وہ سلمان کو دھوکا دے کر چوری چھپے رقم نہیں دے گی۔

شاہدہ بازار سے خریداری کر کے لوٹی ہی تھی کہ ڈرائنگ روم کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کے پیر تھم گئے۔ اندر سے سلمان کی آواز آرہی تھی، "یار تم کتنے گھٹیا آدمی ہو جس لڑکی نے تم سے محبت کی تم پر بھروسہ کیا تمہیں اپنے دل سے لے کر جسم تک دے دیا آج تم اسی کو بلیک میل کر رہے ہو۔"

"یہ تو اچھا ہے کہ وہ تمہاری بیوی نہیں بنی ورنہ ہر رات تم اس کو بیچ کر رقم وصولا کرتے۔"

یہ سن کر شاہدہ کو زور کا چکر آیا اور وہ ڈرائنگ روم کے دروازے پر ہی گر پڑی۔

گرنے کی آواز سن کر سلمان باہر آ گئے اور شاہدہ کو دیکھ کر کہنے لگے "جانم، تم سے کتنی بار کہا کہ جب بھی بازار جایا کرو تو جوس وغیرہ پی لیا کرو۔"

پھر وہ ساجد کی طرف گھومے جو ان کے ساتھ ہی باہر آ گیا تھا اور کہنے لگے، "دیکھو، آئندہ کبھی فون مت کرنا۔ جب بھی پیسوں کی ضرورت ہو میرے پاس آ جانا۔ میں سمجھوں گا کہ میں نے ایک کتا اور پال لیا ہے۔"

ادھر شاہدہ سوچ رہی تھی کہ اس نے تو کوئی اچھا کام بھی نہیں کیا پھر اسے یہ فرشتہ کیسے مل گیا۔۔۔

دیوتا

یہ کوئی پردھانی کا چناؤ تو تھا نہیں کہ تھوڑی بہت دھمکی دے کر جیت لیا جاتا۔ یہ تو ایم پی کا الیکشن تھا جس کو جیتنے کے لئے صرف دولت ہی کافی نہیں ہوتی کچھ کارنامے کرنے پڑتے ہیں کچھ تیاگ کرنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر ووٹر خوش ہوتا ہے اور آپ کے حق میں ووٹ ڈالتا ہے۔ یہ سب باتیں اب موہن بابو کے سمجھ میں آ رہی تھیں۔ اور وہ اس گھڑی کو کوس رہے تھے جب یار دوستوں کے کہنے میں آ کر انہوں نے ایم پی کا الیکشن لڑنا منظور کر لیا تھا۔

ان کے دوستوں نے انہیں سمجھایا تھا کہ زندگی عیش سے گزارنے کے لئے صرف دولت کا ہونا کافی نہیں ہے بلکہ آدمی کا سیاست میں داخل ہونا بھی ضروری ہوتا ہے اور سیاست میں آ جانے پر ہاتھ پیر زیادہ کھولے جا سکتے ہیں۔ پھر نہ تو جنتا کچھ بگاڑ سکتی ہے اور نہ پولس ہی کچھ کر پاتی ہے۔ اسی پہیلی پر غور و فکر کے بعد وہ الیکشن کے اکھاڑے میں کود پڑے تھے۔ بے انتہا دولت لٹانے کے بعد انہیں اس بات کا پکہ یقین ہو گیا تھا کہ مخالف کا پلہ کافی بھاری ہے کیونکہ وہ ایک شریف اور نیک نام آدمی ہے اور ان کے پاس باپ دادا کی چھوڑی ہوئی نیک نامی اور دولت میں سے صرف دولت ہی رہ گئی ہے۔ نیک نامی تو وہ کب کی کھو چکے ہیں اور صرف دولت کے سہارے وہ کبھی الیکشن نہیں جیت سکیں گے۔

لیکن اب تک کا ان کا رکارڈ تھا کہ انہوں نے جو چاہا اسے حاصل کر لیا چاہے وہ کسی کی زمین ہو یا کسی کی عورت۔

زندگی کی ایک ہی بازی میں ابھی تک انہیں کامیابی نہیں ملی تھی اور وہ ستارہ کا قُرب تھا۔

ستارہ ان کے گاؤں کے کمہار کی لڑکی تھی۔ اوپر والے نے اپنے اس شاہکار کو کمہار کے گھر شاید اس لئے اتارا تھا کہ اسکو دیکھ کر کمہار اپنے شاہکار بناتا رہے۔ وہ جتنی خوبصورت تھی اتنی ہی تیز بھی تھی۔

دو ہی ایک ملاقات میں موہن بابو کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ گاؤں کی ان لڑکیوں سے بالکل مختلف ہے جو ان کے ایک اشارے پر اپنا سب کچھ لٹا چکی تھیں۔ انہیں یہ بھی یقین تھا کہ یہ لڑکی ڈرانے دھمکانے میں بھی نہیں آئے گی۔ اس لئے انہوں نے اس کو پیار محبت کے جال میں پھنسانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ ہر بار کترا کر نکل گئی۔

دو ایک بار موہن بابو نے دل کی رانی کے ساتھ ساتھ اسے گھر کی ملکہ بنانے کی بات بھی کی لیکن بہت اطمینان سے یہ کہہ کر کہ "آپ کی حویلی میں ایک چھوٹی ذات کی کنیا شوبھا نہیں دے گی کسی اپنے برابر والی کی تلاش کر لیجئے" اس نے ان کا منہ توڑ جواب دے دیا تھا۔ اس کے بعد سے موہن بابو کافی محتاط ہو گئے تھے مگر ستارہ کو حاصل کرنے کی طلب اور بڑھ گئی تھی۔ انہوں نے یہ ٹھان لیا تھا کہ ہر قیمت پر اسے انکی حویلی میں ایک بار آنا ہو گا۔

لیکن آج کل اس الیکشن کے چکر میں وہ سب کچھ بھولے ہوئے تھے۔ اب الیکشن جیتنا ان کی خواہش ہی نہیں عزت کا سوال بن چکا تھا۔ اور اب انہیں کسی بھی طرح یہ الیکشن جیتنا تھا۔

الیکشن میں صرف دس دن رہ گئے تھے اور ابھی تک انہیں دس فیصد ووٹ ملنے کی امید بھی نہیں تھی۔ برابر وہ ایک ہی بات سوچے جا رہے تھے کہ کوئی ایسا کارنامہ انجام دیا جائے جس سے الیکشن ان کے حق میں ہو جائے۔ لیکن اتنی کم مدت میں وہ کیا کر سکتے تھے۔ آخر تھک ہار کر انہوں نے اپنے دوست سکندر کو بلوایا جو ان کے ہر برے کام میں برابر کا شریک اور راز دار تھا۔ حالانکہ اس مشکل گھڑی میں اس سے کسی مفید مشورے کی امید نہیں تھی لیکن جب اپنا دماغ کام نہ کرے تو دوسروں پر بھروسہ کرنا ہی پڑتا ہے۔

دوسرے دن صبح ہی صبح رامو کمہار دوڑا دوڑا ان کی حویلی آیا اور روتے ہوئے بتایا کہ وہ جب صبح اٹھا تو اس نے اپنی بیٹی کو ستارہ کو گھر میں نہیں پایا۔ کافی تلاش کے بعد بھی جب ستارہ گھر میں نہیں ملی تو وہ غریب مدد کی خاطر موہن بابو کے پاس آیا ہے۔ اسے سب سے پہلے یہاں آنا ہی چاہئے تھا کیوں کہ موہن بابو گاؤں کے سب سے بڑے آدمی تھے اور اس وقت الیکشن میں بھی کھڑے تھے اس لئے ان سے مدد کی سب سے زیادہ توقع کی جاسکتی تھی۔

موہن بابو نے چائے بھی نہیں پی۔ ڈرائیور سے جیب نکلوا کر رامو کے ساتھ فوراً تھانے پہنچے۔

تھانے دار انہیں دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ موہن بابو نے تھانے دار سے کہا ''شرما جی یہ اپنے گاؤں کا کمہار رامو ہے۔ اس کی بیٹی ستارہ غائب ہو گئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ اغوا کا معاملہ ہے۔ آپ کو ہر صورت میں ستارہ کی تلاش کرنا ہے۔ یہ صرف رامو کی عزت کی بات نہیں پورے گاؤں اور میری عزت کا سوال بھی ہے۔ یہ کہہ کر انہوں نے رپورٹ لکھوائی اور رامو کے ساتھ واپس آ گئے۔

دوپہر تک موہن بابو نے شہر کے ہر بڑے افسر تک ستارہ کے غائب ہو جانے کی خبر پہنچا دی اور ان سے اسے تلاش کروانے کی درخواست کی۔

موہن بابو جیسے بھی تھے تھے تو ایک بڑے آدمی اور اس وقت تو ایم پی کا الیکشن لڑ رہے تھے ان کی دوڑ دھوپ کا یہ اثر ہوا کہ ہر طرف ستارہ کی تلاش زور شور سے شروع ہو گئی۔ گاؤں والے جو اب تک موہن بابو کی گندی حرکتوں کی وجہ سے ان سے متنفر رہا کرتے تھے انکی اس دوڑ دھوپ سے بہت متاثر ہوئے سبھی ایک زبان ہو کر کہہ رہے تھے موہن بابو جیسے بھی ہوں اس وقت گاؤں کی عزت کی خاطر کتنا پریشان ہو رہے ہیں۔

ادھر اخباروں نے ان کی دردمندی اور غریبوں سے بے پناہ محبت کی باتیں لکھنا شروع کر

دیں۔

تین دن کی زبردست تلاش کے بعد شہر کے ایک بوسیدہ سے مکان میں نیم مردہ حالت میں ستارہ مل گئی۔ جس حال میں وہ پائی گئی اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ بات اتنی بڑھ چکی تھی کہ ڈاکٹری معائنہ ہوا اور اس کے بے دردی سے لوٹے جانے کے سارے ثبوت مل گئے۔

لوٹنے والے کا نام اور حلیہ وہ نہ بتا سکی کیونکہ جس کوٹھری میں وہ رکھی گئی تھی وہاں ہر وقت اندھیرا رہتا تھا اور اس کی عزت کا شکاری بھی سر سے پیر تک سیاہ لبادے میں آتا تھا۔

اخبار والے یوں بھی چٹ پٹی خبریں زیادہ چھاپتے ہیں اور اس وقت تو انہیں لکھنے کا خوب موقع تھا کیونکہ تین دن سے وہ ستارہ کے غائب ہونے اور اس کی تلاش کے بارے میں برابر لکھ رہے تھے۔

ستارہ کی برآمدگی اور آبرو لٹنے کی خبروں کے ساتھ موہن بابو کے بیان کو بھی انہوں نے پہلے صفحہ پر ہی جگہ دی جس میں انہوں نے حکومت سے لے کر پولس کے محکمے تک کو خوب لتاڑا تھا۔

ستارہ جب سے لوٹی تھی اسے ایک چپ سی لگ گئی تھی۔ کئی مرتبہ اس نے خودکشی کی کوشش بھی کی لیکن رامو کے ہوشیار رہنے کی وجہ سے اسے کامیابی نہیں ملی۔ یہ ساری باتیں رامو آکر موہن بابو کو بتا جاتا تھا۔

الیکشن سے تین دن پہلے اخبار والوں کو ایک خبر ملی کہ موہن بابو ستارہ سے شادی کر رہے ہیں۔ اس خبر کی تصدیق کے لئے سبھی ان کی حویلی کی طرف دوڑ پڑے۔ حویلی میں چھوٹی موٹی کانفرنس کا سا ماحول تھا۔ ہر اخبار والا موہن بابو سے ان کے اس اچانک اور انوکھے فیصلے پر سوال کر رہا تھا اور وہ اس خبر کی تصدیق کرتے ہوئے سبھی کو اس شادی میں شرکت کی دعوت دے رہے تھے۔

شام کو پورا گاؤں روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ ہر طرف کاریں اور جیپیں کھڑی ہوئی تھیں۔ موہن بابو کی شادی میں سبھی افسر اور پریس والوں نے شرکت کی تھی۔

بہت دھوم دھام سے ستارہ کو رخصت کرا کر موہن بابو حویلی میں لے آئے۔ ستارہ راستہ بھر یہ سوچ کر روتی رہی تھی کہ جسے وہ بدکردار اور برا آدمی سمجھ کر ٹھکراتی آئی تھی وہ ایک دیوتا سمان آدمی ثابت ہوا۔ یہ اس کی بلند کرداری ہی تو ہے کہ ایک نیچ ذات کی اور وہ بھی لٹی ہوئی بدنام لڑکی کو اتنا مان دیا کہ اس سے شادی کر لی۔

دوسرے دن ہر اخبار نے پہلے صفحے پر موہن بابو اور ستارہ کی خوب بڑی سی تصویر چھاپی اور دل کھول کر ان کے اس قدم کی تعریف کی۔

ہر اخبار نے لکھا تھا کہ آج دیش کو موہن بابو جیسے آدمی کی ضرورت ہے جو غریبوں کا مسیحا اور بے سہاروں کا سہارا بننے کو تیار ہو۔

موہن بابو کے اس کارنامے نے انہیں مشہور ہی نہیں بلکہ مقبول بھی کر دیا۔ الیکشن ہوا اور انہیں نوے فیصد ووٹ ملا۔ بھاری اکثریت سے وہ جیتے تھے۔ ہر طرف موہن بابو کی جے جے کار ہو رہی تھی۔

موہن بابو کے اتنے بڑے بلیدان اور تیاگ کے بعد ان کی شخصیت اب ایسی نہیں رہ گئی تھی جسے آسانی سے فراموش کر دیا جاتا۔ اس لئے انہیں منتری بھی بنا دیا گیا۔

سویرے جب پریس والے ان سے انٹرویو لینے پہنچے تو انہیں ایک خبر اور ملی کہ رات میں جب موہن بابو حلف لے کر لوٹے تو انہیں ستارہ دیوی کی لاش ملی۔ رات میں کسی وقت ستارہ دیوی نے موہن بابو کی پستول سے خودکشی کر لی اور ایک پرچہ موہن بابو کے نام چھوڑ گئیں جس میں اس نے لکھا تھا کہ وہ اپنے ناپاک وجود سے موہن بابو جیسے دیوتا صفت آدمی کی زندگی میں زہر نہیں گھولنا

چاہتیں اسلئے یہ دنیا چھوڑ کر جارہی ہیں۔

موہن بابو کے پی اے سکندر صاحب نے بتایا کہ اس وقت صاحب ستارہ دیوی کی موت سے بہت اداس ہیں اس لئے کسی کو انٹرویو نہیں دے سکتے آپ لوگ پھر کسی وقت آیئے گا۔ پریس والوں کے جانے کے بعد سکندر کے ساتھ شراب پیتے ہوے موہن بابو نے کہا اگر ستارہ کے اغوا کی کہانی نہ رچی جاتی تو ہم کبھی الکشن نہ جیت پاتے ۔ یہ تو اچھا ہوا کہ اسکو مار دیا گیا ورنہ ایک دن سارے راز کھل جاتے ۔ یہ کہہ کر موہن بابو قہقہہ لگاتے ہیں سکندر بھی انکے ساتھ ہنسنے لگتا ہے۔۔۔

بھوکے گدھ

گدھوں کی ایک ٹولی بہت دیر سے آسمان پر منڈرا رہی تھی۔ بہت دنوں کے بعد آج انہیں بھوک مٹانے کا موقع ہاتھ آیا تھا۔ چند لوگ مل کر ایک نہتے آدمی کو بری طرح مار رہے تھے۔ وہ اپنے بچاؤ کی پوری کوشش کرنے کے ساتھ ہی لوگوں کو مدد کے لئے بھی پکار رہا تھا۔ وہاں موجود ایک بہت بڑی بھیڑ اس کے اس طرح پٹنے پر اظہار افسوس کرنے کے ساتھ ہی مارنے والوں کو برا بھلا بھی کہہ رہی تھی لیکن اس کی مدد کرنے کو کوئی بھی آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔

ایک کمزور انسان بھیڑیے نما انسانوں سے آخر کب تک لڑتا۔ دھیرے دھیرے اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ لڑتے لڑتے تھک گیا اور خون سے لت پت زمین پر گر پڑا۔

اوپر منڈرا رہے گدھوں کو انسانوں کی اس ظالمانہ حرکت پر بہت افسوس ہوا۔ آخر یہ کیسے انسان ہیں جو اپنی ہی نسل پر کس قدر ظلم کرتے ہیں۔ لیکن پیٹ کی دہکتی ہوئی آگ نے انہیں بہت دیر تک اچھائی اور برائی پر سوچنے کا موقع نہیں دیا۔ بھوک لگنے پر جہاں انسان اپنے رشتے ناتے، تمیز و تہذیب، جائز و ناجائز سب کچھ بھول جاتا ہے تو گدھوں کی ٹولی جو بھوک سے جاں بلب ہو رہی تھی کہاں تک ان باتوں کا دھیان رکھتی۔ اب تو بس وہ اس انتظار میں تھے کہ مارنے والے ہٹیں تو وہ اپنی بھوک مٹائیں۔

ارے! یہ کیا ہو رہا ہے۔ مارنے والے اب مرنے والے کے جسم پر ٹوٹ پڑے۔ کوئی اس کی آنکھیں نکال رہا تھا کوئی گردا نوچنے کی کوشش کر رہا تھا اور کوئی اس کی کھال اتار رہا تھا۔

گدھوں کے سردار نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ چلو اب رزق کی تلاش کہیں اور کریں انسانوں نے اب ہماری غذا پر بھی قبضہ کر لیا ہے۔۔۔

اور وہ سچ مچ مر گیا

اسے شدید زخمی حالت میں اسپتال لایا گیا تھا۔ کون لایا تھا یہ پتہ نہ چل سکا۔ خدا کے کچھ نیک بندے جو زخمی کے لئے اجنبی تھے اسے اسپتال میں داخل کر کے اپنے اشرف المخلوقات ہونے کا فرض ادا کر کے چل دیے تھے۔ ان ہی کی زبانی یہ بھی پتہ چلا کہ زخمی شخص اپنی اسکوٹر پر کہیں جا رہا تھا کہ مخالف سمت سے آنے والے ٹمپو نے اسے ٹکر مار دی۔

دو گھنٹے تک وہ اسپتال کے ایمر جنسی روم میں پڑا رہا۔ ڈاکٹر، جس کا یہ اولین اخلاقی فرض و ذمہ داری ہے کہ وہ کسی زخمی کو فوری طبی امداد پہنچائے، اس کی خیریت تک پوچھنے نہیں آیا۔ ڈیوٹی پر موجود دونو ڈاکٹر پرائیوٹ وارڈ میں بھرتی کسی وی آئی پی کی مزاج پرسی میں مصروف تھے۔

پورا اسپتال اس بات سے اچھی طرح واقف تھا کہ اسپتال میں آنے والا زخمی انسان اکثر اسپتال کے قابل اور مقبول ڈاکٹروں کو اپنی تنظیم کے بینر تلے اعزاز سے نوازتا رہتا ہے۔ اسپتال کی ہر تحریک چاہے پلس پولیو کی ہو یا ایڈس سے متعلق ہو اس میں وہ شانہ بہ شانہ چلتا تھا۔ اس بات کا صلہ تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ اسے وی وی آئی پی ٹریٹمنٹ ملتا لیکن دو گھنٹے کے بعد شروع ہونے والے اعلاج میں اسپتال سے لگائی جانے والی ایک سوئی کے علاوہ بس ایک گندہ سے بستر دے دیا گیا تھا۔ اس کے بعد ایک لمبا چوڑا نسخہ اس کے گھر والوں کو تھما دیا گیا جو بازار سے خرید کر آتا رہا۔

دھیرے دھیرے یہ خبر شہر میں گشت کرنے لگی کہ وہ ایک حادثہ میں بری طرح زخمی ہو کر اسپتال میں داخل ہے۔ اخبار نویسوں نے تھوڑی مہربانی ضرور کی اور اس حادثہ کو انہوں نے اس سرخی

کے ساتھ شائع کر دیا کہ 'ایک سماج سیوک اسپتال میں خود سیوا کا محتاج''۔

اب وہ ہوش میں آچکا تھا اور اسے امید تھی کہ اس کے زخمی ہونے کی خبر سن کر پورا شہر ٹوٹ پڑیگا۔ آخر بیس سالوں سے وہ شہر میں سماجی، ثقافتی اور ادبی پروگراموں کی جان جو تھا۔ شہر کے ہر درجہ کا آدمی اسے جانتا و پہچانتا تھا۔ افسران اسے نہ صرف اچھی طرح پہچانتے تھے بلکہ عزت بھی دیتے تھے۔ نہ جانے کتنے لوگوں کو مانجھ کر اس نے بہترین آرٹسٹ بنا دیا تھا۔

اسے امید تھی کہ کمشنر نہ سہی ضلع مجسٹریٹ تو ضرور اس کی مزاج پرسی کو آئیں گے اور اسپتال والوں کو اس کا خاص خیال رکھنے کی ہدایت بھی دیں گے۔ لیکن اس کی یہ سوچ بے کار و بے معنی نکلی۔ اس کو دیکھنے نہ تو ضلع مجسٹریٹ آئے نہ وہ ڈاکٹر صاحبان آئے جنہیں وہ پچھلے دنوں اپنی تنظیم کے بینر تلے اعزاز سے نواز چکا تھا۔ نہ ہی شہر کی بھیڑ آئی اور نہ ہی وہ لوگ ہی آئے جنہیں اس نے اپنے بیسیوں پروگراموں کا حصہ بنا کر آج بڑا آرٹسٹ بنا دیا تھا۔ جو لوگ اسے شہر میں قومی یکجہتی کی نشانی مانتے تھے ان کا بھی کہیں پتہ نہیں تھا۔

خیالات کا سلسلہ نرس کی سوئی سے ٹوٹا جو اس کے بازو میں پیوست ہو چکی تھی۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ اُف! کتنا بھیانک خواب تھا۔ اس کا پورا بدن پسینے میں تربتر ہو گیا۔ خدانخواستہ اگر یہ سچ ہوتا تو میں اسے برداشت کر پاتا۔ جس عزت اور شہرت کو پانے کے لئے میں نے اپنے قیمتی بیس سال اس سماج کو دیئے ہیں کیا وہ مجھے یہ صلہ دے گا۔ درد کی ایک ٹیس اس کے سینے میں بائیں جانب اٹھتی ہے اور وہ چند لمحوں میں دل کے شدید دورے کی شکل میں تبدیل ہو کر اس کا کام تمام کر دیتی ہے اور وہ سچ مچ مر جاتا ہے۔۔۔

ان داتا

موہن کو فاقہ کرتے ہوئے آج دوسرا دن تھا۔ گھر میں اناج کا ایک دانہ نہ بچا تھا اور جو تھوڑا بہت بچا بھی رہا ہوگا اس سے بچوں کے پیٹ کی دوزخ بھر دی گئی تھی۔ ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا اکثر موہن کو اس قسم کے حالات سے گزرنا پڑتا تھا۔ ایک مل کے چوکیدار کی آمدنی کتنی ہوتی ہے۔ جو بھی ہوتی ہے اس سے پندرہ دن بھی گھر چلانا مشکل ہوتا ہے۔ وہ بھی موہن کا گھر جہاں اس کی بیمار ماں کے علاوہ بیوی اور چار بچے بھی رہتے ہیں۔

گھر کا خرچ آدھے مہینے تو مل کی تنخواہ سے چلتا تھا اور آدھے مہینے ادھار اور فاقوں سے گزرتا تھا۔ اب کی موہن کو نہ تو بنئے سے ادھار مل سکا اور نہ ہی گوپال بابو سے۔ گوپال بابو کو تیرتھ یاترا پر بھی آج ہی کل جانا تھا۔ ارے بھائی تیرتھ یاترا کرنی تھی تو مہینے کے شروع میں چلے گئے ہوتے جس وقت موہن کے پاس تنخواہ ہوتی ہے۔ مہینے کے دوسرے حصہ میں کیا گئے موہن کے چولہے کی آگ بھی ساتھ لیتے گئے۔

ہر جگہ سے مایوس ہو کر موہن تھک کر بیٹھ گیا۔ اب سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا کہ گوپال بابو کا انتظار کیا جائے۔ وہ فرشتہ صفت انسان جب لوٹ کر آئے گا تب گھر میں چولہا جلے گا۔ لیکن سب سے بڑا مسئلہ بچوں اور بیمار بوڑھی ماں کا تھا۔ موہن اور اس کی بیوی کو تو فاقہ کرنے کی عادت سی پڑ چکی تھی۔

موہن نے مل کے منیجر سے کچھ ایڈوانس مانگنے کی ہمت باندھی جبکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ مل کا منیجر انتہائی بے رحم آدمی ہے۔ اس نے کبھی کسی ملازم کی مدد نہیں کی۔ لیکن بھوک سے تڑپتے

بچوں نے اسے منیجر کے بنگلے تک جانے کو مجبور کر دیا۔ ایک گھنٹہ کے انتظار کے بعد منیجر صاحب لان میں آئے۔ وہ دوڑ کر ان کے پیروں پر گر گیا۔ ''صاحب آج دو دن سے میرے گھر میں چولہا نہیں جلا ہے۔ بچے بھوک سے بیتاب ہیں۔ میری بیمار ماں کے پیٹ میں بھی دال کا پانی تک نہیں جا سکا ہے۔ آپ کی کچھ مہربانی ہو جائے تو ایڈوانس مل جائے اگلی پگار میں سے کاٹ لیجئے گا۔''

منیجر صاحب مل میں کام کرنے والے آٹھ سو ملازمین کی غریبی اور تنگ حالی سے اچھی طرح واقف تھے۔ انہیں یہ پتہ تھا کہ موہن کی تنخواہ اتنی نہیں ہوتی کہ اس سے مہینے کا خرچ چل سکے۔ ایسی صورت میں وہ اپنی ذمہ داری پر اسے ایڈوانس کیوں دیتے۔

موہن جب تم اپنی تنخواہ سے پورا مہینہ نہیں چلا پاتے ہو تو ایڈوانس کیسے واپس کرو گے۔ میں تمہارے بچوں کی بھوک مٹانے کے لئے اپنی نوکری تو داؤں پر نہیں لگا سکتا۔ جاؤ کہیں اور سے انتظام کرو۔ مجھے ایک ضروری کام سے باہر جانا ہے۔ منیجر صاحب کے بنگلہ سے موہن سر جھکائے باہر آتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ اگر آج کھانے کا انتظام نہ ہو سکا تو میرا دو سال کا ببلو بھوک سے مر نہ جائے۔

اچانک موہن کے دماغ میں بجلی کی طرح ایک خیال کوندا اور اس کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ کیوں نہ سیتارام بابو سے مدد مانگی جائے جنہیں کچھ ہی دن پہلے موہن اور اس کے گھر والوں نے اپنے قیمتی ووٹ سے سبھاسد بنایا تھا۔ موہن دوڑا دوڑا سیتارام بابو کے گھر پہنچا۔ سیتارام بابو اپنے چمچوں سے گھرے باہر برآمدے میں بیٹھے اپنی آمدنی بڑھانے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ کہو بھائی موہن کیسے آنا ہوا۔ موہن نے ہاتھ جوڑ کر بنتی کی۔ سیتارام بابو آپ ہمارے پالن ہار ہیں۔ ہمیں پچاس روپئے دے دیجئے دو دن سے ہمارے گھر میں چولہا نہیں جلا ہے۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے تمہارے چولہے کو تھوڑا آرام تو مل جائے گا۔ اپنے یہاں تو مہینوں آگ بجھنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔

سیتارام بابو کی اس بات پر سوائے موہن کے سبھی ہنس پڑے۔ 'صاحب ہنسی مذاق مت کرو کھالی پیٹ ہنسا بھی نہیں جاتا۔' موہن کہاں سے تمہیں پیسے دے دوں اپنا تو خود بڑا لمبا خرچہ ہے۔ پانچ ہزار کی تو مہینے میں چائے پی لی جاتی ہے۔ صاحب ہم نے آپ کو ووٹ دیا ہے اسی ووٹ کے بدلے ہمیں پچاس روپئے دے دو۔ بھائی خوب کہا تم نے اگر ہم ووٹ کے بدلے پچاس پچاس روپئے دیتے رہے تو ہمارے علاقہ میں کل ۱۵۰۰ ووٹ ہیں یعنی ڈیڑھ لاکھ سوا ہا اور کل جب ہم ایم ایل اے کا الیکشن لڑیں گے تو ہمارے علاقے میں کل ۲ لاکھ ووٹر ہونگے تب تو بیسوں لاکھ بانٹ کر کنگال ہو جائیں گے۔ صاحب ہمیں حساب نہ بتاؤ بس پچاس روپئے دے دو۔ موہن نے بڑی عاجزی سے کہا۔

اب سیتارام بابو کی زندہ دلی غائب ہوگئی ابے تیرا ادھار کھائے ہیں کیا جو صبح صبح چلا آیا ہے۔ موہن کے دماغ پر بھوک چڑھ رہی تھی اس نے بھی اسی طرح کہا ''ہاں'' ادھار تو کھائے ہو صاحب ہمارے ووٹ نے تمہیں یہ مقام دیا ہے سبھاسدی سے پہلے تمہارے پاس تھا ہی کیا؟ آج پیسے والے بن گئے ہو تو آنکھیں دکھا رہے ہو۔ نکال باہر کرو اس کو گھر چڑھ کر بدتمیزی کر رہا ہے۔ جب تک سیتارام کے چمچے موہن کو باہر نکالتے تب تک سیتارام کے وفادار کتے جیکی نے یہ کام کر دیا۔ وہ غراتا ہوا موہن پر جھپٹ پڑا۔ بھاری بھرکم کتے کی دہشت سے موہن بے تحاشہ سڑک کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ کتے سے موہن اتنا ڈر گیا تھا کہ اس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ سڑک پر بھاگ رہا ہے۔ گیہوں سے لدا ہوا ایک تیز رفتار ٹرک جو پیچھے سے آرہا تھا اس نے موہن کی بھوک ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹا دی۔ ایک بھوکا آدمی اب ایک لاوارث لاش میں تبدیل ہو گیا تھا۔

جب تک اس حادثہ کی خبر موہن کے گھر والوں تک پہنچتی تب تک سیتارام بابو اپنے چمچوں کے ساتھ موہن کی لاش کے قریب دھرنے پر بیٹھ چکے تھے۔ انہیں ایم ایل اے کے الیکشن کے لئے

کسی اہم مدّے کی تلاش تھی اور ایک بھوکے غریب کی حادثاتی موت سے اچھا موقع اور کون سا ہو سکتا تھا۔ دو گھنٹے تک جب سڑک پر جام لگا رہا تو سارا ٹریفک رک گیا تب سرکاری افسروں کے اس وعدے پر کہ مرنے والے کے گھر والوں کو ایک لاکھ روپئے معاوضہ ملے گا سیتا رام بابو نے دھرنا ختم کیا۔

شام کو پانچ بجے موہن کی ارتھی کے ساتھ بہت بھیڑ تھی۔ جس کی اگوائی سیتا رام بابو کر رہے تھے۔ آگے پیچھے سارا ٹریفک رکا ہوا تھا۔ جیتے جی تو موہن ایک ٹرک کو نہ روک سکا جو اسے روندتا ہوا نکل گیا مگر مرنے کے بعد ہزاروں سواریاں رک کر اس کی ارتھی کو عزت دے رہی تھیں۔۔۔

موہن کے گھر والوں کو سرکار کی طرف سے ایک لاکھ روپیہ مل گیا جس سے ان کے سارے دکھ درد دور ہو گئے۔ ادھر سیتا رام بابو کی غریبوں سے محبت رنگ لائی اور وہ ایم ایل اے بن گئے۔ کبھی پچاس روپئے کے لئے موہن سیتا رام بابو کو پالن ہار کہہ رہا تھا اور آج مر کر سیتا رام بابو کا پالن ہار بن گیا۔۔۔

ابھی ایمان زندہ ہے

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ نثار کا بھوک کے مارے برا حال تھا۔ وہ بہت تیزی سے اپنا آٹو رکشہ گھر کی جانب دوڑا رہا تھا۔ صبح پانچ بجے وہ گھر سے نکلتا تھا اور رات گیارہ بارہ بجے گھر لوٹ پاتا تھا۔ صبح چلتے وقت تھوڑا سا ناشتہ کر لیتا اور دن میں ماں کا دیا ہوا ٹفن کام آتا باقی دو ایک بار چائے تو پی ہی لیتا تھا مگر کچھ کھاتا نہیں تھا۔ چائے تو ڈیڑھ روپے میں مل جاتی ہے کھانے میں زیادہ پیسے خرچ ہوتے ہیں۔ نثار کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ خرچ کم سے کم ہو اور کمائی زیادہ سے زیادہ۔

آج گھر لوٹنے میں دیر ہو گئی تھی۔ اس لئے اس کا آٹو ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔ رات کا سنناٹا تھا ٹریفک بہت کم ہو گیا تھا لیکن مرکری کی تیز روشنی میں سڑکیں چمک رہی تھیں۔ نثار نے دور سے ہی دیکھ لیا کہ تاج ہوٹل کے سامنے ایک آدمی کھڑا ہاتھ ہلا رہا ہے۔ بھوک کہہ رہی تھی کہ جلد از جلد گھر پہنچ جائے۔ لیکن پانچ ستارہ ہوٹل تاج کے سامنے کھڑی سواری اسے اچھے کرائے کی دعوت دے رہی تھی۔ رات کا وقت تھا سواری کو جلدی کوئی دوسرا آٹو نہیں ملے گا۔ اس وقت نثار جو بھی کرایہ مانگے گا اسے مل جائے گا۔ یہی سوچ کر اس نے پیر بریک پر جما دیئے۔

ایک آدمی سوٹ پہنے ہاتھوں میں بریف کیس لئے اس سے کہہ رہا تھا ”میری گاڑی خراب ہو گئی ہے مجھے ڈفینس کالونی پہنچا دو۔ جو کرایا مانگو گے دے دیا جائے گا“۔ بیٹھ جایئے۔ نثار نے پچھلی سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ بیس منٹ کے راستے میں نثار یہی سوچتا رہا کہ گوشت پوست کا یہ بھی آدمی ہے۔ اس کے بھی دو ہی ہاتھ پیر ہیں۔ لیکن ہم دونوں کی قسمت میں کتنا فرق ہے۔ یہ آدمی

پانچ ستارہ ہوٹل سے نکل کر اپنے بڑے سے بنگلے میں جا کر سو جائے گا۔ کل صبح اسے اٹھنے کی کوئی جلدی نہیں ہوگی۔ لیکن میری زندگی کے اٹھارہ گھنٹے روزانہ آٹو پر گزرتے ہیں۔ سارا دن سڑکوں پر بھاگتا پھرتا ہوں۔ دن میں کئی بار ٹریفک پولس کی گالیاں سنتا ہوں۔ تب بھی گھر کا خرچ پورا نہیں پڑتا۔ ایک بوڑھی ماں ہے جس کی دوا کی ذمہ داری، دو بہنیں جنکی شادی کی فکر ایک چھوٹا بھائی جس کی تعلیم کے خرچ کے لئے وہ صبح سے شام تک محنت کرتا رہتا ہے۔ سب سے بڑھ کر آٹو رکشہ کی آٹھ سو روپیوں کی قسط جو ہر مہینے پابندی سے جانی چاہیے وہ بھی نہیں جا پاتی۔ چار ماہ سے اس نے بینک کی قسط ادا نہیں کی ہے۔ کئی بار بینک والے نوٹس بھیج چکے ہیں۔ کسی دن اس کا آٹو نہ ضبط کرلیں۔ اگر ایسا ہو گیا تب کیا ہوگا۔

''بس یہیں روک دو۔'' پیچھے بیٹھے ہوئے شخص کی آواز سے اس کے خیالات کی ڈور اچانک کٹ گئی۔ ایک عالی شان بنگلے کے سامنے اس کا آٹو کھڑا تھا۔ سو سو کے پانچ نوٹ اس کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے وہ شخص بولا ''کم ہوں تو بتاؤ''۔ ''نہیں صاحب نہیں بہت ہیں''۔ نثار نے سوچا تھا کہ دوگنا کرایہ لے گا۔ یہاں تک کے ساٹھ روپئے بنتے تھے اور دوگنا ایک سو بیس روپئے بنے۔ لیکن یہاں تو حاتم طائی سے پالا پڑا تھا۔ پانچ سو ایسے دے دیئے جیسے ہم لوگ کبھی کبھی رکشہ والے کو آٹھ آنے کی بجائے ایک روپیہ دے دیتے ہیں۔

خان صاحب کے احاطہ میں آٹو کھڑا کر کے جب وہ چلنے لگا تو اس کی نظر پیچھے سیٹ پر پڑے ہوئے ایک خوبصورت بیگ پر پڑی۔ یقیناً یہ اسی سواری کا ہوگا جس نے اسے پانچ سو روپئے دیئے تھے۔ بیگ اٹھا کر جب نثار نے اس کی چین کھولی تو اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ پورا بیگ نئے نوٹوں کی گڈیوں سے بھرا تھا۔ صرف پانچ سو کے نوٹوں کی دس گڈیاں تھیں یعنی پانچ

لاکھ روپے۔ پہلی بار نثار نے اتنے ڈھیر سارے نوٹ دیکھے تھے۔ پانچ لاکھ کی رقم اٹھانے میں اسے کپکپی سی محسوس ہو رہی تھی۔ نئے نوٹوں کی گڈیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ اچانک دماغ میں ایک خیال آیا ان نوٹوں سے میرا کیا تعلق یہ تو میری سواری کی امانت ہیں جس کو واپس کرنا میرا فرض ہے۔ میں نے کوئی چوری تو نہیں کی ہے نہ ہی ڈاکہ ڈال کر یہ روپے حاصل کئے ہیں۔ میرے آٹو پر پڑے ملے ہیں اس لئے میرے ہیں۔

چوری نہ کرنا ایمانداری نہیں ہے۔ جو چیز ہماری نہیں ہے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا ایمانداری ہے۔ نثار کے دماغ میں ایک ہلچل مچی تھی۔ بھوک کب کی غائب ہو چکی تھی۔ دل اور دماغ کے مابین ایک جنگ چل رہی تھی۔ دل کہہ رہا تھا یہ روپے تمہارے ہیں۔ دماغ اس کو پرائی امانت ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اچھا اگر یہ روپے ہمارے نہیں بھی ہیں تب بھی اس شخص کے لئے یہ رقم کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی۔ سمندر سے ایک لوٹا پانی نکال لینے سے سمندر کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہاں میرے لئے یہ روپے بہت اہم ہیں۔ میری پوری کائنات بدل سکتے ہیں۔ آٹو رکشہ کی ساری قسطیں ایک ہی بار میں ادا کی جا سکتی ہیں۔ ماں کی آنکھوں کا آپریشن، بہنوں کی شادی، بھائی کی تعلیم کا خرچ سب کچھ پورا ہو جائے گا۔ ہر قرض ادا ہو جائے گا۔

بیگ لے کر وہ گھر میں داخل ہو گیا۔ بیگ کی رقم کو اپنا بنانے کے فیصلے کے بعد اس کے اندر ایک اعتماد پیدا ہو گیا تھا۔ بڑی طاقت ہوتی ہے پیسے میں۔ آج وہ آٹو رکشہ کا ڈرائیور نہیں تھا۔ پانچ لاکھ کا آدمی تھا۔ یعنی لکھ پتی ساہوکار۔

''لاؤ ماں کھانا دو آج بہت دیر ہو گئی۔'' ہاں بیٹے تمہارا انتظار کر کے بھائی بہن بھی سو گئے۔ کھانا کھاتے ہوئے اس نے ماں سے کہا ماں تمہاری آنکھوں کا آپریشن اب جلدی سے کرا

دیتے ہیں۔ تمہیں بہت پریشانی ہوتی ہے۔''

''میری آنکھوں کی فکر بعد میں کرنا پہلے آٹو کی قسط ادا کرنے کی سوچ۔ کہیں بینک والوں نے آٹو ضبط کرلیا تو فاقے کی نوبت آجائے گی۔''

پلیٹ کھسکاتے ہوئے نثار بہت زور سے ہنسا۔ ''اتنی آسانی سے بینک والوں کو آٹو ضبط کر لینے دیں گے۔'' اچھا ماں اب باقی باتیں صبح بہت تیز نیند آرہی ہے۔ ماں یہ سوچتی رہ گئی کہ آج بیٹے کی آواز میں اتنی خوداعتمادی کہاں سے آگئی۔

صبح جب پانچ بجے ماں نے نثار کو جگایا تو اس نے کہا'' ماں مجھے سونے دو آج میں دیر سے نکلوں گا''۔ پانچ بجے صبح اٹھنے والا نثار آج آٹھ بجے تک بستر پر پڑا رہا۔ آرام سے ناشتہ کیا پھر ایک کپ چائے کی فرمائش کرکے ماں کے پاس آگیا۔ ''اماں تم نے کہیں بہنوں کے رشتے کی بات چلائی یا نہیں''۔

''یہ آج تجھے کیا ہوگیا ہے۔ شادی بیاہ کی بات اس وقت کی جاتی ہے جب جیب میں دو پیسے ہوں۔ یہاں تو گھر چلانا مشکل ہورہا ہے اس میں شادی بیاہ کہاں سے ہوسکتا ہے۔'' ''تم شادی طے کرو دھوم سے شادی کرنا میری ذمہ داری ہے۔'' اماں جو کل رات سے بیٹے کا ایک نیا روپ دیکھ رہی تھی ایک دم سے سنجیدہ ہوگئی۔ ''تمہیں روپے کہاں سے ملے۔'' ماں کے اس اچانک سوال سے نثار ٹپٹا گیا۔

''کیسے روپے ماں۔ میرے پاس روپے کہاں ہیں۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا شادی طے ہو جائے تب روپے کا انتظام بھی ہوجائے گا۔''

''بیٹا نثار جب اوپر والا آنکھوں کی بینائی چھین لیتا ہے تو اس کے بدلے بصیرت کی روشنی

دے دیتا ہے۔ کل رات ہی سے میں ایک نیا بیٹا دیکھ رہی ہوں ایک نیا نثار۔"

"یہ طاقت اور اعتماد اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان کے پاس اس کی ضرورت سے زیادہ دولت ہوتی ہے۔ اب سچ سچ بتا کہ تیرے پاس کتنے روپے ہیں۔ اور یہ روپے کہاں سے آئے۔"

نثار کے پاس اس کے علاوہ اور دوسرا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ماں سے سچ سچ بتا دے۔ اس نے روپے ملنے کی بات ماں کو بتا دی۔

"یہ روپے لیکر ابھی جا اور اس آدمی کو واپس کر آ۔" پانچ لاکھ کی رقم نے ماں کے کردار کو ذرا بھی ڈانواں ڈول نہیں کیا۔

"اس رقم سے تو اپنی ساری پریشانیاں دور کرلے گا۔ سب قرض بھی ادا کر دے گا لیکن بے ایمانی کا جو قرض تیرے اوپر چڑھے گا وہ تو قیامت تک ادا نہ ہو سکے گا۔ ایک قرض لیکر دوسرا قرض ادا کرنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ رہی اپنی پریشانیوں کی بات تو جو پریشانیوں میں ڈالتا ہے وہی نکال بھی لیتا ہے۔ اللہ چاہئے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"اب جا جلدی سے جا کر روپے واپس کر آ۔ پرائی چیز زیادہ دیر تک اپنے پاس نہیں رکھتے۔"

نثار جب رات والے شخص کی کوٹھی پر پہنچا تو وہ ناشتے کی میز پر تھے۔ انہوں نے اسے وہیں بلوالیا۔

"کہو بھائی کیسے آنا ہوا۔"

"صاحب یہ بیگ آپ کا کل رات آٹو کی سیٹ پر چھوٹ گیا تھا۔" نثار نے بیگ ان کی طرف بڑھا دیا۔

''اچھا بیٹھو''۔ بیگ لیتے ہوئے وہ نثار کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔ اس کے بعد بیگ سے ایک گڈی نکالی اور نثار کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا ''یہ تمہاری ایمانداری کا انعام ہے''۔

''اس بیگ میں پانچ لاکھ روپئے ہیں۔ اگر مجھے روپئے لینا ہوتا تو بیگ کیوں واپس کرتا۔ مجھے جو ملنا چاہئے تھا وہ رات میں آپ مجھے دے چکے ہیں۔'' یہ کہہ کر نثار جانے لگا۔

''ٹھہرو، تم کہاں رہتے ہو، ذرا اپنا پتہ بتانا۔'' نثار نے اپنے گھر کا پتہ بتا دیا۔

''شام کو میں تمہارے گھر آؤں گا، گھر پر ہی رہنا۔'' یہ کہہ کر وہ بھی اٹھ گئے۔ ''اچھا خدا حافظ اب گھر جاؤ۔''

شام کو نثار کے گھر کے سامنے ایک لمبی سی کار آکر رکی۔ صبح جن صاحب سے نثار مل کر آیا تھا وہی کار سے نیچے اترے اور نثار کے ساتھ اسکے چھوٹے سے گھر کے ایک کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔

''تمہاری ماں سے ملنے آیا ہوں، انہیں بلاؤ۔''

نثار نے ماں کو آواز دی۔ سر پر آنچل ڈالے جیسے ہی نثار کی ماں سامنے آئی وہ صاحب کھڑے ہو گئے۔

آداب کے بدلے جیتے رہو سننے کے بعد انہوں نے کہنا شروع کیا ''میرا نام صابر ہے، اللہ کا دیا میرے پاس بہت کچھ ہے، بس چند ایماندار ساتھیوں کی تلاش ہے، آج کی دنیا میں ایمانداری کی پرکھ بہت مشکل ہے، ایماندار شخص کی تلاش میں لاکھوں روپئے میں برباد کر چکا ہوں، کل رات بھی میں نے نوٹوں سے بھرا بیگ جان بوجھ کر آٹو میں چھوڑ دیا تھا، آج صبح جب نثار نے میرا بیگ واپس کیا تو میری تلاش مکمل ہو گئی، مجھے ایک ایماندار ساتھی مل گیا۔''

''لوگ چند روپیوں کے لئے ایک دوسرے کا قتل کر دیتے ہیں، لیکن آپکے بیٹے نے پانچ

لاکھ روپے کو بھی اہمیت نہیں دی، اس کے لئے آپ قابل مبارک باد ہیں، آپ نے ایک ایماندار بیٹا پیدا کیا ہے۔"

"میں بالکل اکیلا ہوں، میرے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے، آج سے نثار میرے کاروبار میں برابر کے شریک ہیں، کل میں کاغذات تیار کر کے ان کے حوالے کر دوں گا۔"

نثار اپنی ماں کے ساتھ صابر صاحب کی باتیں اس طرح سن رہا تھا جیسے کوئی خواب چل رہا ہو۔ جس میں ایک فرشتہ آ کر اسے بادشاہت ملنے کی خوش خبری سنا رہا ہو۔

نثار کو ایمانداری کا اتنا بڑا اصلہ ملے گا اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ وہ پانچ لاکھ میں بے ایمانی خرید رہا تھا لیکن اس کی ماں نے کروڑوں روپے اس کی ایمانداری کی قیمت لگوا دی۔۔۔

شک کے سائے

موٹر سائکل کے پاس کافی بھیڑ لگ چکی تھی ۔ ہر ایک اسکو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے وہ ایک خطرناک بیماری ہے اور کسی بھی لمحے سبکو لگ سکتی ہے ۔ دھیرے دھیرے پورا محلہ اکٹھا ہو گیا ۔ لالہ جی جنکے متعلق یہ مشہور تھا کہ انکی دوکان کے شٹر اٹھنے سے لوگ اپنی گھڑیاں ملاتے ہیں کیوں کہ انکی دوکان کھلنے میں کبھی ایک سکنڈ کا بھی فرق نہیں ہوتا تھا ۔ آج وہی لالہ جی بڑے اطمینان سے موٹر سائکل کے پاس کھڑے ہوے مولوی صاحب سے باتیں کر رہے تھے ۔ مولوی صاحب جنکی زندگی بہ ظاہر مسجد اور مدرسے کے درمیان گزر رہی تھی وہ بھی اس وقت یہاں ٹھہرنا اپنا پہلا فرض سمجھ رہے تھے ۔

بہت دیر کی بھن بھناہٹ کے بعد شنکر کی گرجدار آواز سے سبھی اسکی طرف متوجہ ہو گئے ۔ وہ مولوی صاحب سے کہہ رہا تھا ' یہ شریف لوگوں کا محلہ ہے اور ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ باہر والے یہاں آ کر راس لیلا کھیلیں ۔ بہت دیر ہو چکی ہے اب میں اس ۔ ۔ ۔ کو باہر نکال کر حساب کتاب برابر کر دیتا ہوں ۔ ' مولوی صاحب جو ٹھنڈا کر کے کھانے کے عادی تھے کہنے لگے ' تھوڑی دیر اور دیکھ لیں پھر کاروائی کی جائے ۔

بات صرف اتنی تھی کہ سامنے والے مکان میں دو مہینے سے ایک ماں بیٹی آ کر رہ رہی تھیں اور اتنے دنوں میں نہ تو ماں کسی سے کچھ مانگنے گئی تھی نہ بیٹی کو کسی چیز کی ضرورت پڑی تھی ۔ گھر میں کوئی مرد بھی نہیں تھا پھر بھی یہ دونوں بغیر کسی کی مدد کے بہت مزے میں زندگی گزار رہی تھیں ۔ بس یہی بات محلے والوں کو کھٹک رہی تھی ۔ ایک بار لالہ جی نے اپنی دوکان کی خدمات پیش کی تھیں لیکن شگنتلا

دیوی نے بہت ہی خوبصورتی سے یہ کہہ کرٹال دیا تھا کہ 'جب بھی ضرورت پڑی آپ ہی لوگوں سے مدد لیں گے۔' شنکر جو اس محلے کے لڑکوں کا باس اور ہر لڑکی کا گارجن تھا اس نے بھی سیما کی 'سرپرستی' کرنی چاہی تھی لیکن ٹکا سا جواب مل جانے پر تپا ہوا بیٹھا تھا۔ عورتوں کو یہ فکر تھی کہ بغیر کسی سے کچھ مانگے شکنتلا دیوی کا کام کیسے چلتا ہے۔

آج اس موٹر سائکل والے نے محلے والوں کی اس تمنا کو پورا کر دیا تھا کہ ماں بیٹی پر کوئی الزام لگا کر انھیں تنگ کر سکیں۔ ویسے یہ بات تھی بھی عجیب کہ محلے والے تو دروازے تک نہ جا سکیں اور باہر والا گھنٹوں اندار بیٹھا رہے۔

ایک دم سے سامنے والا دروازہ کھلا اور ایک خوبصورت نوجوان آدھی آستین کی آسمانی رنگ کی شرٹ اور سفید پینٹ پہنے ہوے باہر نکلا۔ اسکے پیچھے دروازے میں شکنتلا دیوی اور سیما کا چہرہ بھی دکھائی دیا۔ ان لوگوں کو دیکھتے ہی بھیڑ میں خاموشی چھا گئی۔ پھر سیما کی آواز پر سب چونکے جو کہہ رہی تھی 'سلیم بھیا اگلے سنیچر کو ضرور آیئے گا میری سالگرہ ہے۔' سیما کی اس بات سے سبھی کی نگاہیں سلیم کی کلائی کی طرف اٹھ گئیں جس پر ایک بہن کا پیار بندھا تھا۔ دھیرے دھیرے موٹر سائکل کے پاس سے بھیڑ ہٹنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد سلیم بہت آرام سے موٹر سائکل پر بیٹھا واپس جا رہا تھا ۔کسی میں کچھ کہنے کی ہمت نہیں تھی۔ شائد سبکو یہ احساس ہو گیا تھا کہ شکنتلا دیوی اور سیما بے سہارا نہیں ہیں۔۔۔

مختصر تعارف

نام :- سید منظر مہدی

پیدائش:- ۱۴جولائی ۱۹۵۴ء فیض آباد (یوپی)

تعلیم:- ایم اے (اُردو) ایل ایل بی

دل چسپی:- ہر اس چیز میں جس سے صحت اور کردار کو بہت نقصان نہ پہنچے

بانی اور جنرل سکریٹری:- گلدستہ پروڈکشن سوسائٹی (ایک ثقافتی سماجی اور ادبی تنظیم)

صدر:- اردو پریس ایسوسی ایشن

شائع کتابیں 'مجنوں کی واپسی' (اردو) مزاحیہ خاکوں کا مجموعہ ، ' زمیں دار صاحب' ڈراموں کا مجموعہ (ہندی)

ADDRESS
GULDASTA LANE , IMAMBARA ,
FAIZABAD (U.P)
PHONE ; 05278 - 260111, 225881